ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

دسمبر-جنوری ۲۰۲۱ء | جلد ۱۲ | شمارہ ۶-۷ | ربیع الثانی-جمادی الاولی ۱۴۴۲ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

''میں ان جیسے المیوں سے کوئی خطرہ نہیں محسوس کرتا بلکہ مجھے اصل خطرہ اس ضمیر سے ہے جس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا، ضمیر کا کام ہے احتساب اور غلطیوں کی گرفت، خواہ وہ اپنے باپ اور بھائی سے سرزد ہوئی ہو یا کسی ذی وقار پیشوا اور رہنما سے، اگر یہ ضمیر مردہ ہوجائے اپنا فطری عمل چھوڑ دے، اپنی افادیت کھو بیٹھے، اور اس میں حقائق کے اعتراف کی صلاحیت باقی نہ رہ جائے، تو یہ سب سے بڑا خطرہ ہے، یہ انسانیت کی موت ہے، ایک انسان مرتا ہے تو ہزاروں انسان پیدا ہوجاتے ہیں، لیکن جب ضمیر مردہ ہوجائے، اجتماعی اور قومی ضمیر سے زندگی کے آثار ناپید ہوجائیں، جب قوم سے محاسبہ کی صلاحیت اور جرأت ختم ہوجائے، جب تنقید واحتساب کی جگہ شاباشی، اور داد وتحسین کے پھول برسنے لگیں تو یہ ایسا المیہ ہوگا جس کے بعد کسی المیہ کا تصور ہی ممکن نہیں۔'' (عالم عربی کا المیہ ص ۱۱۸-۱۱۹) (حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ)

شرح خریداری

فی شمارہ: ——— 25:00 روپے
سالانہ: ——— 250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ: ——— 500:00 روپے
بیرونی ممالک: ——— 30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال): ——— 4000:00 روپے

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی' کوارسی بائی پاس علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by Abdullah Marofi, Mob. 8218439622; email-almarufi.abdullah369@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	کسب حلال کی تلقین	محمد عارف ندوی	
۲۔	اداریہ	فکری زاویے	مدیر	۳
۳۔	مطالعہ قرآن	اللہ کے محبوب بندوں کی خصوصیات	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۱۲
۴۔	گوشۂ سیرت	رسول اللہ ﷺ کی بے مثال زندگی	ابوفہد	۱۴
۵۔	// //	سیرت رسول ﷺ کا سماجی پہلو	عبدالرشید طلحہ نعمانی	۱۸
۶۔	// //	سیرۃ النبی ﷺ اور مذہبی رواداری	مولانا ندیم احمد انصاری	۲۱
۷۔	ناموسِ رسالت	توہین رسالت کا قضیہ	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۴
۸۔	بحث و تحقیق	قصۂ غرانیق کا علمی وتنقیدی جائزہ	محمد خالد ضیا صدیقی ندوی	۲۸
۹۔	فکر و نظر	تدبرِ کائنات، اسلامی ایمانیات اور قرآن مجید.....	مولانا محمد عبداللہ شارق	۳۴
۱۰۔	// //	تحفۃ الأحوذی اور معارف السنن کے تناظر میں	حافظ انس بلال	۴۵
۱۱۔	تعلیم و تربیت	سزا کے سلسلہ میں کچھ عمومی نصیحتیں	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۵۱
۱۲۔	شخصیات	استادِ گرامی پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی مرحوم	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	۵۶
۱۳۔	// //	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی علیہ الرحمہ	ڈاکٹر جمشید احمد ندوی	۶۳
۱۴۔	تعارف و تبصرہ	''اہل کتاب اور مسئلہ کفر وایمان'' (ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۷۹
	// //	''قرآنی سفر''	// //	۸۲
	// //	''تذکرہ''	// //	۸۴
	// //	قرآن کریم اور درپیش مسائل کا حل.....	ڈاکٹر محمد صادق اختر ندوی	۸۷
۱۵۔	گوشۂ ادب	تاریخ در گذشت	رئیس احمد نعمانی	

❁ ❁ ❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

ادا ریہ

فکری زاویے

کرونا کے سبب وابستگان مدارس ومساجد کا معاشی بحران

صورت حال —— مسائل —— مستقبل حل کی تلاش

اس وقت پوری دنیا جس وبا کا مقابلہ کررہی ہے اوراس کے سبب جس معاشی بحران کا سامنا کررہی ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، چھوٹے بڑے سرکاری وغیر سرکاری، تجارت پیشہ وغیر تاجر سب ہی پریشان ہیں، پریشانی اور نقصان میں تو کمی بیشی ہوسکتی ہے لیکن اس سے انکار کی کوئی صورت نہیں، ہم نے پہلے ہی لکھا تھا کہ ہمارے ملک میں کرونا سے زیادہ اموات لاک ڈاؤن کے بحران اور پھر بھوک مری سے ہوں گی مگر اس کا ڈیٹا نہیں ملے گا، واقعہ یہ ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے، دیگر امراض، پھر امراض کا علاج نہ ہونے، علاج کے لیے پیسے نہ ہونے، غذائی بحران، تنخواہیں نہ ملنے، روزگار ختم ہونے سے جو اموات ہوئی ہیں یا تو ان کا کچھ پتہ نہیں یا انھیں بھی وبائی اموات کا نام دے دیا گیا، وقتاً فوقتاً خودکشی کی بھی خبریں آتی رہی ہیں، سب سے زیادہ تکلیف دہ خبر ایک مدرسہ کے مدرس اور مسجد کے امام کی خودکشی کی تھی جس نے دل ودماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، عالمی پیمانے پر مابعد کرونا واقع ہونے والی تبدیلیوں پر بحث جاری ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ کرونا کے سبب سب سے زیادہ بحران کا شکار ہمارے دینی ادارے ہوئے ہیں، آئندہ مزید بحران کا اندیشہ ہے، آئندہ ہونے والی تبدیلیوں کے پیش نظر ہمیں ابھی سے اپنے لائحہ عمل کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔

ہم جانتے ہیں کہ بہت سے مدارس بحمد للہ اب بھی اپنے وابستگان کی مدد سے اپنے ملازمین کو تنخواہیں دے رہے ہیں، مگر ایسے بھی مدارس ہیں جنھوں نے ایک دو ماہ کے بعد تنخواہوں کا سلسلہ روک دیا، ملازمین کو فارغ کردیا، یکسر جواب دے دیا، ایسے بھی ہیں جنھوں نے آدھی تنخواہ دی، کسی مہینہ دی اور کسی مہینہ نہ دی، ایسے بھی واقعات سامنے ہیں کہ ملازمین کو بجٹ نہ ہونے کا حوالہ دے کر فارغ کردیا مگر لاک ڈاؤن میں بھی لاکھوں کی تعمیرات کا سلسلہ چلتا رہا، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مدارس کا پورا نظام عوامی تعاون پر منحصر ہے، اگر عوام کے معاشی حالات میں ابتری آئی ہے تو مدارس پر اس کا خاطر خواہ اثر پڑنا لازمی بات ہے، ایسے میں جو مدارس اپنے ملازمین کو وقت پر تنخواہیں دے رہے ہیں ان مدارس کے ذمہ داران، وابستگان و معاونین سب ہی قابل مبارکباد ہیں، جو معاشی بدحالی کا شکار ہوکر بند ہوگئے ہیں یا حالات سے جوجھ رہے ہیں ان کی حالت قابل رحم اور قابل افسوس ہے، جنھوں نے بجٹ ہوتے ہوئے بھی اپنے ملازمین سے بے اعتنائی برتی یا ان کے لیے بالکل کوشاں نہ رہے وہ قابل گرفت اور عوامی جواب دہی کے مستحق ہیں۔

اس عالمی وبا کے بعد دنیا کا منظر نامہ بدلا ہوا ہوگا، بہت سی تبدیلیاں سامنے آئیں گی جن کے آثار نمایاں ہیں، مدارس و مساجد کے نظام پر اس وبا کی وجہ سے جو اثرات پڑے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ آئندہ خالص عوامی تعاون پر انحصار ناممکن

نہیں تو مشکل ضرور ہوگا، جو لوگ زمینی حقائق سے واقف ہیں اور لوگوں سے جن کا رابطہ ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں، لہٰذا اب اس سمت میں غور وفکر ہونا چاہیے کہ آخر وابستگان مدارس ومساجد کو اور خود اس نظام کو خود کفیل کیسے بنایا جائے، اس ضمن میں بہت سی تجویزیں آتی رہتی ہیں، متعدد بار کئی چیزوں کو میں خود بھی پیش کر چکا ہوں، یہاں اختصار کے ساتھ اس سلسلہ میں کچھ روشنی ڈالنے کی پھر کوشش کرتا ہوں۔

یہ کہنا درست نہیں بلکہ یہ کہہ کر عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا کہ مدارس کی تعلیم کا کمانے سے کوئی تعلق نہیں، یہ تو حفاظتِ دین اور اشاعتِ دین کے لیے قائم کیے جاتے ہیں، بالکل درست ہے کہ مدارس کا قیام حفاظتِ اسلام اور اشاعتِ اسلام کا بڑا مؤثر اور کامیاب ذریعہ ہے، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ دینی تعلیم اور دینی مناصب تاریخ کے کسی دور میں بھی کسبِ معاش کا ذریعہ نہیں رہے، آج بھی بظاہر نہیں ہیں، پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ بغیر معاوضہ نہ کوئی ناظرہ پڑھانے والا ملتا ہے نہ امامت کرنے والا، یعنی اب دینی تعلیم اور دینی مناصب کسبِ معاش کا ذریعہ بھی ہیں اور طرفہ یہ کہ ان سے بنیادی انسانی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں، بنیادی ضروریات اگر پوری نہ ہوں تو انسان ہر وقت نفسیاتی وذہنی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے، سماجی دباؤ کا شکار رہتا ہے، عملاً جو برتری اور خود داری ان مناصب کے لیے ضروری ہے، اس کا فقدان نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ امر بالمعروف کا عمل تقریباً غیر موثر ہے جبکہ نہی عن المنکر تو تقریباً مفقود ومتروک ہے، بلکہ اگر اور جرأت سے کہنے دیجئے تو اسی وجہ سے ایک عجب سا فساد معاشرہ میں برپا ہے، ایک بڑی تعداد کا انحصار قومی وملی تعاون پر ہے، ماضی میں دینی تعلیم، امامت وافتا سے وابستہ ہونے والوں کا معاشرہ میں بڑا مقام و احترام ہوتا تھا، حکومتیں ان کا انتظام کرتی تھیں، لوگ ان کی خدمت کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے، وہ اپنے ذرائع آمدنی بھی خود پیدا کیا کرتے تھے، اس کے برخلاف آج حکومتیں اگر کسی ملک میں کفیل ہیں تو کفالت کے عوض وہ ضمیر ہی خرید لیتی ہیں، پھر ایسے رزق سے بھی کیا حاصل جو پرواز میں کوتاہی کا سبب بنے یا پرواز پر ہی قدغن لگا دے، ہمارے یہاں تو خیر اس کا تصور ہی نہیں، رہے عام لوگ تو وہ کفالت تو کرتے ہیں مگر تعارف کراتے وقت ساتھ میں ''بیچارے امام صاحب'' ''بیچارے مولانا صاحب'' ضرور لگا دیتے ہیں، مسجد کا امام اور مدرسہ کا مدرس اگر اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے کوئی اور کام کرے تو ذمہ داران کو ناگوار گذرتا ہے، جبکہ بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لیے بیس سے پچیس ہزار روپیے ماہانہ تو درکار ہوتے ہی ہیں، پھر یہ ضروریات ہر شخص کے ذاتی معیار کے سبب بڑھتی ہی رہتی ہیں جو یہاں زیر بحث نہیں، جن چیزوں کو ہم بنیادی ضرورت کہتے ہیں وہ پوری سب کی ہوتی ہیں، کسی کی ملازمت سے، کسی کی موروثی کھیتی وباغات کی آمدنی سے، کسی کی تجارت یا تجارتی شراکت سے، کسی کی ہدایا وتحائف سے، کسی کی دوسروں کے ذریعہ ذمہ داری اٹھا لینے سے، مگر عام ائمہ اور بالخصوص مدارس کے عام مدرسین کی ذاتی زندگی انتہائی کشمکش سے بھری ہوتی ہے، ان کی ذاتی ضروریات اور بنیادی ضروریاتِ زندگی کے سامنے ہمیشہ سوالیہ نشان ہوتا ہے، ہمیں بعض مرتبہ ایسی بے حسی پر حیرت ہوتی ہے، مثلاً ایک مسجد یا مکتب ومدرسہ جس کے متولی سے لے کر تمام مقتدیوں تک کی ماہانہ آمدنی پچاس ہزار سے لاکھ دو لاکھ تک ہوتی ہے اور سب کے پاس عالیشان مکانات ہوتے ہیں لیکن امام وموذن کی تنخواہ ۵/ ۷ ہزار ہی دی جاتی ہے وہ بھی بادل ناخواستہ، مدارس کے عام مدرسین کا حال اس سے بھی برا ہوتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ ان کی بنیادی ضروریات کچھ اور ہوتی ہیں یا یہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں۔

آئندہ (مستقبل قریب) کی تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے اور اس صورت حال پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ ذمہ داران مدارس اپنے نظام ونصاب میں بنیادی تبدیلی کا عزم ضرور کریں، ثانویہ یعنی (ہائی اسکول) کی تعلیم میں یکسانیت کی منصوبہ بندی

آئندہ پیش آنے والے بہت سے مسائل کا حل ہے جس کا ذکر ہم نئی تعلیمی پالیسی کے ضمن میں کر چکے ہیں، مدارس کے ساتھ اوقاف کی تعمیر و تیاری بہت ضروری ہے، اداروں کے قیام کے ساتھ مستقل ذرائع آمدنی کی منصوبہ بندی نہایت ضروری ہے جس سے ہم یکسر غافل رہے ہیں، افسوس کی بات ہے کہ سینکڑوں سال گذر جانے کے بعد بھی ہماری تنظیمیں اور ادارے خود کفیل ہونے کے بجائے عوامی تعاون پر ہی منحصر ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ عوامی دباؤ سے مکمل طور پر آزاد بھی نہیں ہو پاتے، کیا یہ ممکن نہیں کہ ذمہ داران مدارس جس طرح لوگوں سے تعاون کی درخواست کرتے ہیں اسی طرح اپنے متعلق کچھ اہل ثروت کو اس پر متوجہ کریں کہ ایک اچھی رقم مدرسہ کو بطور تعاون یا بطور قرض دے دیں، مثلاً مدرسہ ۲۵/لاکھ کی ایک رقم کسی کاروبار میں لگا دے اور یہ طے کرے کہ اس کی آمدنی کا نصف جن کی رقم ہے ان کو واپس کیا جائے گا اور نصف مدرسہ کو دیا جائے گا، اس طرح ایک قلیل مدت میں رقم لگانے والوں کی رقم واپس ہو جائے گی، مدرسہ کی ایک رقم کاروبار میں ہوگی اور تنخواہوں کے لیے ایک مستقل ذریعہ آمدنی ہوگا، اسی طرح اور بھی ذرائع ہو سکتے ہیں، اچھی جگہوں پر اہل خیر کے ذریعہ دکانوں کا نظم، مختلف کاروبار میں شراکت داری وغیرہ، اس طرح ایک شفاف آمدنی سے اچھی تنخواہوں کا انتظام ہوسکتا ہے اور اداروں کو خود کفیل کیا جا سکتا ہے، ائمہ اور مؤذنین کا مسئلہ تو نہایت آسان ہے بشرطیکہ متولی و مقتدی انھیں اپنی ہی طرح کا انسان سمجھیں، کروڑوں کی مساجد تعمیر کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ مساجد سے متصل ان کے لیے ایک قابلِ رہائش گھر بھی تعمیر کریں، ہر محلّہ کے لوگ اگر اپنی آمدنی سے ایک اور آدھا نہیں بلکہ آدھے کا بھی آدھا فیصد اگر ائمہ و مؤذنین کے لیے نکال لیں تو قطعاً کسی فریق کو کوئی پریشانی باقی نہ رہ جائے گی، اگر مسجد کے ساتھ ہی کوئی دکان بنا دی جائے اور اسے ائمہ و موذنین کے لیے خاص کر دیا جائے تو یہ سب سے بہتر کفالت ہوگی، نمازوں کے درمیان کے اوقات میں وہ تجارت کریں اور پھر اپنی ذمہ داریاں پوری کریں، دراصل ہمیں زہد، توکل، قناعت، صبر و رضا، کسبِ حلال اور کسبِ معاش اور فقر کے صحیح قرآنی مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے، سوچ کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے، معاشرہ سے تفاوت اور اونچ نیچ کی مختلف شکلوں کو ختم کرنے کی ضرورت ہے، دینی تعلیم اور دینی مناصب کو با اختیار و باوقار بنانے کی ضرورت ہے، یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بنیادی ضروریات کی تکمیل کے بغیر انسان کوئی کام اس طرح نہیں کر پاتا، جس طرح طرح کرنا چاہیے فقر و فاقہ کوئی مستحسن عمل نہیں، ہمہ وقت دوسروں کی مدد پر انحصار کوئی قابل تعریف پہلو نہیں، سیرت نبوی کو پڑھیے تو ہر شخص کو با اختیار بنانے کی مہم کا پتہ چلے گا، یہ پتہ چلے گا کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے، روزی کمانے کی فضیلت بیان کی گئی ہوگی، اقتصادیات کو مضبوط بنانے کے طریقے اپنائے گئے ہوں گے، یہ سب قوم کے سامنے آنا چاہیے اور ان تفصیلات کی روشنی میں محلّہ محلّہ میں، مسجد و مدرسہ کے متعلقین کو مضبوط لائحہ عمل بنانا چاہیے، اہل ثروت کو اپنے دماغ کا علاج کرانا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ مسجد کا امام اور مکتب کا مدرس ان ہی کی طرح کا ایک انسان ہے، اس کی بنیادی ضروریات ہیں، والدین ہیں، بیوی بچے ہیں، علاج و معالجہ کی اضافی ذمہ داریاں ہوتی ہیں وغیرہ، ان تفصیلات کے پیش نظر علماء کو خود بھی چھوٹے چھوٹے گروپ بنا کر چھوٹی چھوٹی تجارتیں شروع کرنا چاہیے اور ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہنر ضرور رکھنا چاہیے۔

کووڈ۱۹ کے سبب تمام شعبہائے زندگی متاثر ہوئے ہیں، لیکن سب سے زیادہ شکار ہمارے دینی ادارے ہوئے ہیں اس سمت میں غور و فکر کی خاص ضرورت ہے، خواص کو ذمہ داران کے ساتھ مل کر مستقبل کی منصوبہ بندی کرنا چاہیے اور مابعد کرونا پیدا ہونے والی نئی صورت حال سے نمٹنے کی تیاری کے ساتھ مستقل حل تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

اصلاح کے نام پر فساد

اخوان المسلمون کے خلاف سعودی علماء کا فتویٰ اور مذہبی مہم محض فتنہ انگیزی ہے

تشتت ،تفرق ،تخزب ،تبدیع وتفسیق وتضلیل کو مہم بنالینا کسی طرح بھی شریعتِ اسلامی کے مزاج کے مطابق نہیں، یہ سب کچھ اگر دین کا لبادہ اوڑھ کر شریعت کے نام پر کیا جائے اور هيئة كبار العلماء کے قلم سے انجام دیا جائے تو اس کی خطرناکی مزید بڑھ جاتی ہے، تباہ حال امت کو دھڑوں میں بانٹنے ،ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے گویا امت کے حال سے بے خبر ہیں، مستقبل سے بے فکر ہیں، دشمن کے غلبہ اور اغیار کی غلامی سے مطمئن ہیں، ورنہ اصلاح کے نام پر فساد کی یہ مہم نہ چھیڑی جاتی، امن وسلامتی کی تحریک چلانے والوں کو، امن پسندی کو اپنا ہتھیار بتانے والوں کو دہشت گرد نہ قرار دیا جاتا۔

سعودیہ کی هيئة كبار العلماء نے الاخوان المسلمون کو دہشت گرد جماعت باور کراتے ہوئے ایک بیان جاری کیا تو ساری دنیا کے آزاد قلم اُبل پڑے، منصف اہل علم چیخ پڑے، ہر طرف سے اللہ کا خوف رکھنے والے اس بیان کی تردید کرنے لگے، اس بیان کی صحت وواقفیت پر ہی سوال کھڑے کیے جانے لگے، بفرض محال اگر مان ہی لیا جائے کہ یہ بیان سعودیہ کے کبارِ علماء کی کمیٹی کی طرف سے جاری ہوا ہے اور جمعہ کے خطبہ میں اخوان کی مذمت کیے جانے اور انھیں دہشت گرد بتائے جانے کی خطباء کو ہدایت جاری کی گئی ہے تو بھی ہم ان علماء سے حسن ظن رکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ یہ بیان حکومت کے ظلم وجبر کا نتیجہ ہے، اس نے مجبور کیا ہے، اس کے قہر کے نتیجہ میں یہ بیان جاری ہوا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، آخر علماء کا خون اس قدر سفید کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ آنکھوں سے جو کچھ دیکھیں اسے جھٹلا دیں، اپنے ہی مطالعہ ومشاہدہ کو غلط ثابت کریں، زمانہ جس کی امن پسندی اور اصلاح وتعمیر کی گواہی دے اس کو یہ لوگ دہشت گرد کیسے کہہ سکتے ہیں۔

حکومتوں اور بالخصوص خاندانی حکومتوں کی دلچسپیاں، مفادات اور تحفظات وترجیحات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، ایک دور وہ تھا جب تحریک اخوان سعودی حکمرانوں کی پسندیدہ جماعت تھی، چوٹی کے اخوانی علماء سعودیہ کی تعمیر وترقی کے ضامن تھے، سعودیہ میں تعلیمی انقلاب اور یونیورسٹیز کی تعلیمی چہل پہل اخوانی اہل علم کی مرہون منت تھی، سید قطب سے لے کر دیگر اخوانی مصنّفین کا لٹریچر سعودیہ میں نہ صرف شائع کیا جاتا تھا بلکہ بڑے شوق وقدر سے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا، مولانا مودودی کی ''الجہاد فی الاسلام'' وزارت سے شائع ہوتی تھی، لیکن جب حکومت کا نقطۂ نظر بدلا تو الجہاد فی الاسلام کیا! مولانا علی میاں کی ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' بھی انھیں گراں معلوم ہونے لگی، اس وقت کے حکام کو اسلام پسندی، اسلامی نظام سے وابستگی اور اسلام کو ایک مکمل نظریۂ حیات کے طور پر قبول کرنے سے سخت قسم کا بُعد ہے، تحریک اخوان دنیا کی وہ واحد تحریک ہے جس نے اسلام کے جامع تصور حیات کی کامیاب نمائندگی کی ہے، اس کا طرزِ عمل امن پسندانہ، مصلحانہ اور داعیانہ رہا لیکن اس نے عرب اسرائیل جنگ کے دوران میدان جہاد میں وہ کارنامے دکھائے کہ بڑے بڑے فوجی جرنیل بھی حیران رہ گئے، اس تحریک نے تسبیح ومناجات اور افلاک میں تکبیر مسلسل، خلوت میں لا الہ الا اللہ کی ضربوں اور جلوت میں اسلام کی جُہد مسلسل کی جو عملی تصویریں پیش کی ہیں ان کی مثال ملنا مشکل ہے، اس تحریک کے وابستگان قیام لیل، آہِ سحر گاہی، وظائف ومناجات کے عادی ہوتے ہیں، دعوت وجہاد ان کا مطمح نظر ہوتا ہے، علم وعمل اور خدمت خلق سے ان کی دلچسپی قابل تقلید ہے، کسبِ معاش اور انفاق فی سبیل اللہ میں وہ اپنی مثال آپ ہوتے ہیں، کفِ ید، کفِ لسان، صبر واستقامت، دعوت وجُہد مسلسل میں وہ بے نظیر وبے مثال ہیں، اسلام کے کامل تصور کی

نمائندگی ان کا طرۂ امتیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کے وابستگان کی اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتگان کی ہوتی ہے، بڑے بڑے علماء، وکلاء، ججز، ڈاکٹرز، انجینئرز اور دانشوران اس کے قافلہ سالار رہوتے ہیں، یہ تحریک اخلاص ومحبت، ایثار وقربانی، تعلیم وخدمت کی ایسی تاریخ اپنے دامن میں رکھتی ہے جنھیں سن اور پڑھ کر عہد صحابہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، یہ تحریک بیک وقت تحریک دعوت واصلاح ہے، تعلیمی، سماجی اور سیاسی تحریک ہے، ایسی جامع اور بے نظیر تحریک کو دہشت گرد شمار کرنا کہاں کی انصاف پسندی اور عقلمندی ہے اور ایسا کرنے والوں کے عمل پر خاموش رہنا کس طرح درست رویہ ہوسکتا ہے، یوں تو عرصہ سے عرب حکمرانوں نے اسلام کے تصور کامل سے ارضِ حجاز کو پاک کرنے کی مہم چھیڑ رکھی ہے، وہ نہ صرف نصاب تعلیم کا جائزہ لے رہے ہیں، مکتبات کی صفائی کررہے ہیں، شخصیات کو متہم کررہے ہیں، جمعیات وتحریکات کو دہشت گرد کہہ رہے ہیں، بلکہ ایک طویل فہرست انھوں نے پہلے ہی جاری کر رکھی ہے جس میں انھوں نے علماء کی تنظیموں اور دفاعِ اسلام میں مصروف تاریخی تحریکوں کو بھی دہشت گرد قرار دیا ہے، بلکہ ان تمام اقدامات سے آگے بڑھ کر وہ ایک نئے ''دین اکبری'' کو پیش کرنے کی شاید تیاری میں لگے ہیں، جس کی طرف انھوں نے ''معتدل اسلام'' کے نفاذ کے ذریعہ اشارہ کیا تھا، جس کے بعد انھوں نے نصاب تعلیم، آیات قرآنیہ اور ذخیرہ احادیث کا جائزہ لینے کے لیے ایک ادارہ قائم کیا تھا، اس ضمن میں اور اپنی سابقہ فہرست میں بھی تحریک اخوان، حماس، الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین کو بھی دہشت گرد قرار دے چکے ہیں، سوال یہ ہے کہ جب وہ فہرست پہلے ہی جاری کر چکے تھے تو اچانک اس وقت دوبارہ هيئة كبار العلماء کی طرف سے یہ فتویٰ کیوں صادر ہوا، اور یہ منبروں سے یہ مذمتی مہم کیوں چھیڑی گئی، جس میں نیت کا فتور وفساد شامل ہے، جو سیاسی دباؤ میں دیا گیا فتویٰ ہے، جس میں ایک بھی استدلال واقعی اور درست نہیں ہے، اچانک دوبارہ اخوان کی مذمت بیان کرنے کی یہ مہم کیوں چھیڑی گئی؟

دراصل امریکہ میں ڈیموکریٹس امیدوار کا صدر منتخب ہونا سب سے زیادہ محمد بن سلمان کے لیے پریشان کن ہے، ٹرمپ نے کھلے عام دھمکیاں دیں، عرب حکام کی اصل حیثیت کو سوشل میڈیا پر خود بیان کیا اور دھمکیاں دے دے کر ان سے دولت حاصل کی اور امریکی معیشت کو سہارا دیا، اس کی آڑ میں بن سلمان اپنی من مانیاں کرتا رہا، اور صہیونی ایجنڈوں کی تکمیل کا سامان بہم کرتا رہا، اس دوران ڈیموکریٹس نے کئی مواقع پر ٹرمپ کے خلاف پالیسی اختیار کی، سعودیہ کی سخت تنقید کی، جمال خاشقجی کے قتل پر آواز اٹھائی، سعودیہ کی جیلوں میں بند علماء، دانشوران اور مفکرین کی رہائی کا مطالبہ کیا، اظہار رائے کی آزادی کے نتیجہ میں قید کیے گئے لوگوں کو رہا کیے جانے کا مطالبہ کیا، بالآخر ڈیموکریٹس امیدوار انتخابات میں فتح یاب ہوا تو ٹرمپ کے غلام کا پریشان ہونا لازمی ہے، اس وقت یہ بیان اسی پسِ منظر میں سامنے آیا ہے، حالانکہ راقم کا خیال ہے کہ امریکہ میں صدر بدلنے سے عالم اسلام کے مصائب میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی، مشاہدات کہتے ہیں کہ جو بھی صدر آتا ہے وہ اپنے پیش رو کے کام اور منصوبوں کو مزید آگے بڑھاتا ہے، مسلم دنیا نے سب سے زیادہ امیدیں اوبامہ سے وابستہ کی تھیں مگر خوب معلوم ہے کہ اوبامہ نے کیسے گھناؤنے کھیل کھیلے، ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ کبھی ایرانی لابی کو تقرب حاصل ہوتا ہے اور اس کا ڈنکا بجتا ہے، کبھی سعودی لابی کا زور ہوتا ہے، بظاہر ٹرمپ کی شکست سعودی لابی کی شکست ہے اس لیے بوکھلاہٹ میں نہایت فاسد استدلال پر مبنی یہ فتویٰ صادر کردیا گیا جسے تمام آزاد، دیندار اور غیر سرکاری علماء نے بیک قلم مسترد کردیا۔

سعودیہ نے منابر حرم کو اپنے مقاصد کے بیان واشاعت کے لیے استعمال کرنے کی جو مہم چھیڑی ہے وہ بہت خطرناک ہے، الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین کے صدر محترم شیخ احمد الریسونی نے اس کی سخت ترین مذمت کی ہے، ماضی قریب میں بھی اس کا تجربہ

ہوتا رہا ہے، حج کو عالمی کانفرنس کا عنوان دینا، اس موقع پر وزارت حج کے ذریعہ کانفرنس منعقد کرنا، سرکاری خرچ پر لوگوں کو عمرہ و حج کے لیے مدعو کرنا، اس کی اس پالیسی کا حصہ ہے، حالانکہ حکام نے ہمیشہ یہی دعویٰ کیا ہے وہ حج وحرم کو ہمیشہ سیاسی امور سے دور رکھیں گے لیکن عملاً ایسا ہوا نہیں، حج کے متعلق سالانہ عالمی کانفرنس کا جو تصور عام ہو رہا تھا، اس اصطلاح کا استعمال خود مولانا علی میاںؒ نے کانوں سے سنا اسی کے نتیجہ میں انھوں نے ارکان اربعہ تصنیف کی، انھوں نے اس کتاب کے مقدمہ میں اسباب تصنیف میں ایک سبب یہ بھی ذکر کیا ہے، گزشتہ دنوں بھی یہی ہوا ہے، جب امارات اسرائیل معاہدہ ہوا اور لوگوں نے اس کی مذمت شروع کی تو منبر حرم پر شیخ سدیس نمودار ہوئے اور ولاء براء کی تفصیلات بیان کرنے لگے، یہود و نصاریٰ کے ساتھ حسنِ سلوک کی اسلامی تعلیم کی دہائی دینے لگے، وہ بھول گئے کہ کتنی مرتبہ وہ اپنی پُر درد آواز میں اسرائیل کی تباہی کی دعائیں اسی منبر و محراب سے کر چکے ہیں، ان کا وہ پورا خطبہ کلمة حق اريد بها الباطل اور يلبسون الحق بالباطل کا مصداق تھا، اس سے قبل بھی جب امن پسند مظاہرین کا رابعہ عدویہ میں قتل عام ہوا تھا تو انھوں نے حکومتی پالیسی کی تائید میں واذا قيل لهم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون سے غلط استدلال کرتے ہوئے بیان دیا تھا اور امن پسند شہریوں کو مفسدین باور کرایا تھا، فرانس میں توہین رسالت کھلے عام ہوئی تو دینی فرض تھا کہ اس عمل کی تردید ہوتی، بلاشبہ شیخ سدیس نے اپنے خطبہ میں توہین رسالت کی مذمت کی، مگر حکومت سعودیہ فرانس کے ساتھ کھڑی تھی، عالم اسلام کے ذریعہ جو اقدامات کیے گئے حکومت سعودیہ اس سے دور رہی، امیر مکہ نے سفیر فرانس کا استقبال کیا اور اظہار یکجہتی میں کوئی کسر نہ چھوڑی، شیخ نے بھی فرانس اور اس کے صدر کے اسلام اور پیغمبر اسلام پر مبینہ حملوں کی کوئی مذمت نہیں، کی ہاں اتنا احسان ضرور کیا کہ توہین رسالت کو ایک مذموم عمل قرار دیتے ہوئے اس کی بھرپور مذمت کی، اخوان کی مذمت اس کو دہشت گرد قرار دینے کے لیے اور اس کی مذمت بیان کرنے کے لیے جمعہ کے خطبوں اور مساجد کے منبروں کا استعمال قطعاً درست نہیں، اہل علم کو اس کے خلاف سخت موقف اختیار کرنا چاہیے۔

یہ وہ صورت حال ہے جس پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومتوں کے مفادات یا اپنے ذاتی، تنظیمی یا ادارہ جاتی مفادات سے بالا ہو کر صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہا جائے اور باطل کے علمبرداروں کو آئینہ دکھایا جائے، اگر اس وقت جو آزادی میسر ہے اس کو غنیمت جان کر منکر کی نکیر نہ کی گئی، صحیح رائے اور موقف کے اظہار میں مداہنت برتی گئی تو وہ وقت دور نہیں جب خاموش رہنے والوں کو بھی باطل کی تائید کے لیے مجبور کیا جائے گا، ہمارے ملک میں تو فاشسٹ طاقتیں اس مہم پر آمادہ ہیں، دنیا اس وقت ایک بڑی تبدیلی کی طرف بڑھ رہی ہے، دو بلاک بن رہے ہیں، صحیح وغلط جگ ظاہر ہے، اللہ نے حق و باطل کو واضح کر دیا ہے اور انتخاب کے لیے بندوں کو با اختیار بنایا ہے، یہ بندوں کا کام ہے کہ وہ حق کو اختیار کرتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں یا پھر آیات حق کے بدلہ چند ٹکوں اور حقیر مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔

بہار کے نتائج اور سسکتی جمہوریت

شہریت ترمیمی قانون اور این آر سی تحریک، پھر کرونا اور لاک ڈاؤن کے بعد ہونے والے بہار انتخابات بڑی اہمیت کے حامل تھے، بہار کے اس اسمبلی انتخاب سے مستقبل کا مطلع تقریباً صاف ہو گیا ہے، ذرا غور کیجئے ایک طرف CAA اور NRC کی مخالفت میں طوفان برپا تھا، پھر جب لاک ڈاؤن ہوا تو شاید سب سے زیادہ بہار ہی کے لوگ پریشان ہوئے، ہزاروں کلومیٹر کا پیدل سفر کرنے والوں کی اکثریت بہار کی تھی، گود میں بچے کی لاش دبائے اور شوہر کی موت پر ماتم کرتے ہوئے دوڑنے والی

عورتیں بہار کی ہی تھیں، بھوک سے راستوں میں دم توڑ دینے والے بھی بہار کے تھے، بہار کے ہی وزیر اعلیٰ نے کہا تھا کہ کسی کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں جو جہاں ہے وہیں رہے، بی جے پی حکومت کی ناعاقبت اندیشی سے کہا جاتا ہے کہ پورا ملک پریشان ہے، مہنگائی اور اس پر لاک ڈاؤن کے بعد بڑھی بے روزگاری نے گویا کمر توڑ کر رکھ دی ہے لیکن بہار کے الیکشن میں دوسری بڑی پارٹی کے طور پر ۷۴ سیٹوں کے ساتھ بی جے پی سامنے آئی ہے، پہلی بڑی پارٹی راسٹریہ جنتا دل ہے جس نے ۷۵ سیٹیں حاصل کی ہیں، مصائب کا انبار تھا، حکومت کی غلط پالیسیاں تھیں، آر ایس ایس کا آتنک تھا، بھوک مری تھی، سیلاب کی مار تھی، تیش کا دوغلا پن تھا، ناکام پالیسیاں تھیں لیکن پھر بھی این ڈی اے کی سرکار بنی اور اس طرح بنی کہ نتیش کمار وزیر اعلیٰ ضرور بنے مگر بی جے پی کے رحم وکرم پر، اب دو باتوں میں سے کوئی ایک بات صاف ہے، یا تو یہ سارا کھیل ای وی ایم کا ہے یا پھر فرقہ پرستی کا زہر گھر گھر پہنچ چکا ہے، لالو پرساد یادو اور ممتا بنرجی وغیرہ کا شمار ایسے لیڈران میں ہوتا ہے جن کو آر ایس ایس نہ اب تک جھکا سکی ہے نہ خرید سکی ہے، یہ خوش آئند ہے کہ لالو کی پارٹی کو اب بھی ۷۵ سیٹیں ملی ہیں، جب عوام کو تبدیلی چاہیے تھی تو ۱۵ سال حکومت کرنے کے بعد بھی عوام نے لالو کو کرسی سے اتار دیا، اب یہ ۷۵ سیٹیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ عوام میں تبدیلی کا عزم تھا مگر یا تو ایک بڑی تعداد فرقہ پرستی کے ساتھ ہوگئی اس لیے تبدیلی نہ آسکی یا پھر یہ سارا کھیل ای وی ایم کا رہا۔

اتر پردیش کے انتخابات میں بی جے پی نے سب کا صفایا کر دیا تھا ایسے ہی جیسے لوک سبھا الیکشن میں کیا تھا اور تقریباً یک طرفہ جیت درج کی تھی، نتیجہ میں لوگوں نے شدت کے ساتھ ای وی ایم کو موضوع تنقید بنایا تھا، اس کے بعد چھتیس گڑھ، راجستھان اور مدھیہ پردیش و گجرات کے انتخابات ہوئے اور اب بہار کے الیکشن ہوئے نتائج پر غور کیجئے تو تقریباً سب ایک جیسے اور بہت قریب قریب، 2015 میں بہار میں بی جے پی کو صرف ۵۳ سیٹ ملی تھیں، اب ۷۴ اور اس کی شریک پارٹی جنتا دل یونائیٹڈ تیسرے نمبر پر، فائنل رزلٹ دیکھیے تو فاصلے بہت کم، اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں بقیہ تمام ریاستیں رفتہ رفتہ بی جے پی کی گود میں ہوں گی، پورے بھارت پر اس کی حکمرانی ہوگی، 2024 کا الیکشن اگر ای وی ایم سے ہوا تو مکمل اکثریت کے ساتھ بی جے پی ہی براجمان ہوگی، وقتاً فوقتاً کانگریس زندگی کا ثبوت دیتی ہے لیکن بظاہر لگتا ہے کہ اس نے یا تو مصالحت کر لی ہے یا پھر اس کے لیے اب شکست وریخت سے نکلنا ممکن ہی نہیں، بہار میں اس نے جس طرح الیکشن لڑا اس پر سوالیہ نشان ہے، بلکہ اگر وہ نہ لڑتی تو شاید راسٹریہ جنتا دل تنہا منڈل تک پہنچ جاتی، اتر پردیش میں سپا بھی تقریباً شکست خوردگی کے ساتھ آخری سانسیں لے رہی ہے۔

ہماری قوم کے پاس جذباتی بحثوں کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں، منٹوں سکنڈوں خلافت قائم ہوتی ہے، حصہ داری کے نعرے لگتے ہیں، الزامات کی بارش ہوتی ہے اور پھر اچانک ماتم بپا ہو جاتا ہے، وجہ صاف ہے کہ ہمارے پاس نہ کوئی متحدہ پریشر گروپ ہے نہ دوررس متحدہ قومی پالیسی، یہ جذباتی بحثیں بھی زیادہ تر وہی لوگ کرتے ہیں جنھوں نے اب تک نہ کچھ بنایا ہے اور نہ ان کا کچھ بگڑا ہے، گویا وہ ابھی زمین پر گھٹنوں کے بل بھی نہیں چلے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ سیکولر کہی جانے والی پارٹیوں نے ہمیشہ ہماری قوم کا استحصال کیا ہے اور اس کے ووٹ کا استعمال کیا ہے، ان میں سرفہرست کانگریس ہے، لیکن اس پہلو پر بھی توجہ ہونی چاہیے کہ آپ جس ملک میں رہ رہے ہیں اس ملک میں زندگی گذارنے کے لیے اور ہاتھ پاؤں پھیلانے کے لیے ایک سازگار ماحول کی ضرورت ہے، بجائے اس کے کہ اس ماحول کی تشکیل کی منصوبہ بندی کی جاتی عین اس وقت جبکہ وجود وتشخص کی بقا کا مسئلہ درپیش ہے ہم پھر دوسری بھیانک غلطیاں کرنے میں لگے ہیں، یقیناً کانگریس کے لیے ہماری خود سپردگی ایک غلطی تھی، ایک کو سیکولر اور ایک کو کمیونل قرار دے کر اپنا دوست اور دشمن متعین کر دینا ہماری دوسری غلطی تھی، ایسے ملک میں اقلیتوں کی

سیاست معاہدوں سے مشروط اور موقع پرستی پر مبنی ہونا چاہیے، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا، ملت کے سروں پر قابض لوگوں نے جب جس سے محبت رچائی اس کی جھولی میں ملت کا ووٹ ڈال دیا نتیجہ آج سامنے ہے کہ سیاسی اعتبار سے مسلم ووٹ اس ملک میں تقریباً بے حیثیت ہو چکا ہے، خود سپردگی کے وکیلوں نے نہ کبھی کوئی پریشر گروپ بنایا، نہ شرائط رکھیں، نہ معاہدے کیے نہ اپنے اثر ورسوخ کا صحیح استعمال کیا، بلکہ اگر کبھی کسی نے اپنی حیثیت بنائی اور منوانے پر آمادہ ہوا تو موروثیت کے علمبرداروں نے اس کو ہر طرح سے ناکام کیا، تاریخ بڑی کربناک ہے، بڑے نشیب وفراز ہیں، بڑی تلخیاں اور سچائیاں ہیں، جن کے بیان کا یہ موقع نہیں، اس وقت اہم بات یہ ہے کہ اس ملک کے دستور کو کیسے بچایا جائے، پورے ملک کو فرقہ پرست طاقتوں کے قبضہ میں جانے سے کیسے بچایا جائے، کسی بھی ملک سے اپوزیشن کا خاتمہ ڈکٹیٹرشپ کی ابتدا ہوتی ہے، جبکہ اس ملک میں ڈکٹیٹرشپ کا آغاز ہو چکا ہے، دو چار لوگوں کی چیخ پکار کو بڑی کامیابی تصور کرنے والے کیا یہ بھول گئے کہ دور بدل چکا ہے، راجیہ سبھا میں بی جے پی ابھی اکثریت میں نہیں ہے، پھر بھی اس نے تمام قوانین کو بالائے طاق رکھ کر زرعی بل پاس کرالیا، جب صورت حال یہ ہے تو ایسے میں دو چار زبانوں کے چلنے سے کوئی حاصل نہیں۔

میں بھی اپنی مسلّم سیاسی حیثیت کا قائل ہوں، حصہ داری میرا بھی دیرینہ خواب ہے، برابری کا سودا میرے لیے بھی باعث فخر ہے، حکمتِ عملی سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن مرکزی نقطۂ نظر اور بنیادی احساس یکساں ہے، میرا ماننا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی سیاست کا حل مسلم پارٹی میں نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی قیادت والی سیکولر پارٹی اور دیگر پارٹیوں سے ان کا پروفیشنل اتحاد مسئلہ کا حل ہے، ایسی پارٹیاں بے مقصد و بے سود بلکہ مسلمانوں کے لیے نقصاندہ ہیں جن کی زمین نہ ہو، جن کا کیڈر نہ ہو، جن کا منصوبہ نہ ہو، جن کے یہاں ''وَن مین شو'' ہو، ایسی پارٹیوں کا خود ہی کوئی مستقبل نہیں چہ جائیکہ قوم کا مستقبل ان سے وابستہ ہو، اگر تمام مسلم دھڑے ایک نقطہ پر متحد ہوں اور پھر وہ سب مل کر اپنے اپنے علاقہ کی پارٹیوں کی ناک میں نکیل ڈال سکیں اور ان کے ساتھ حصہ داری کرسکیں تب تو کچھ بات بن سکتی ہے، بہار میں ایم آئی ایم کی کامیابی پر سب مبارکباد دے رہے ہیں لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ آخر حاصل کیا ہوگا ان ۵/ایم ایل ایز کے آنے سے، آندھرا اور اب تلنگانہ میں اب تک کیا حاصل ہوا، ہاں یہ ضرور ہوا کہ ایم آئی ایم کی پالیسی، اس کے طرز گفتگو، انداز بیان نے دوسروں کو شعوری نہیں تو غیر شعوری طور پر فائدہ ضرور پہنچایا ہے، ۵۳/ سے ۷۴ سیٹوں تک پہنچے کا راز معلوم کیجئے تو پتہ چلے گا کہ صرف پانچ سیٹوں پر مسلمانوں کے یک طرفہ ووٹ کرنے سبب یا دو/کُرمی اور دیگر ذاتوں کو اکسایا کہ اپنی پارٹی نہیں بلکہ ہندتوا کے چہرے کو ووٹ کیا جائے، کبھی غور کیجئے کہ آخر جس صوبہ میں ایم آئی ایم پیدا ہوئی اس صوبہ میں اس کی کیا حیثیت ہے، اس پورے صوبہ میں وہ الیکشن کیوں نہیں لڑتی، کیا وہاں تمام مسلم مسائل حل ہو چکے، کبھی وہاں کے مسلمانوں سے مل کر ایک جنرل سروے کیجئے صرف چند اپنے جاننے والوں کی رائے کا اعتبار نہیں، یوٹیوب اور پارلیمنٹ میں کی گئی زوردار تقریریں بے سود ہیں، صرف تقریروں سے مسائل حل نہیں ہوتے، یاد ہوگا کہ پارلیمنٹ میں ایم آئی ایم کے سربراہ نے سرِ عام بل پھاڑ دیا تھا، اپنے اس عمل سے انھوں نے یوٹیوب کے متوالوں کے دل جیت لیے تھے اور جذبات کے تار چھیڑ دیے تھے، مگر مجھ جیسے دیوانے کہہ رہے تھے کہ انھوں نے مسئلہ کو اپنی طرف سے مزید الجھا دیا، ان کا کام بل پھاڑنا نہیں تھا بلکہ ان کی کامیابی اس میں تھی کہ وہ ٹی آر ایس کے ممبران کو اس کی مخالفت کے لیے حیدرآباد سے تیار کرکے آتے، مگر انھوں نے کرنے کا کام نہ کرکے محض جذبات کو جیتنے والا عمل کیا، مسئلہ جذبات کا نہیں، مسئلہ عقل و مستقبل کا ہے، تصور کیجئے کہ ایم آئی ایم کے نام کے ساتھ ہم کتنی دور چل سکتے ہیں، اس کے طرز گفتگو کے ساتھ کتنے غیر مسلموں کو یکجا کرسکتے ہیں، ہم کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے مگر آج شعوری

طور پر یہ جملہ لکھ رہے ہیں کہ موجودہ پسِ منظر میں مختلف جگہوں پر ایم آئی ایم کی ہلکی پھلکی کامیابی میں مسلمانوں کی مزید سیاسی ابتری کا راز پوشیدہ ہے، اس جملہ کی معنویت آپ آئندہ چند برسوں میں دیکھیں گے، جو لوگ ایم آئی ایم میں ملت کے مسائل کا حل دیکھتے ہیں، ان سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس کے سربراہ سے براہ راست ملیں، ان کو آمادہ کریں کہ وہ تقریروں سے باہر نکل کر زمین پر مظلوموں کے مسیحا بن جائیں، اتحاد المسلمین کو مجلس اتحاد مظلومین میں تبدیل کر دیں، وہ اس زبان کا استعمال چھوڑ دیں جو لاشعوری طور پر ڈبیٹ کا رخ موڑ دیتی ہے جو غیر شعوری طور پر ہندو پولرائیزیشن کا سبب بنتی ہے، یہ پولرائیزیشن کا خوف نہیں بلکہ ۲۰۱۴ء سے اب تک کی سب سے بڑی حقیقت ہے، غیر مسلموں کو متحد کر دیتی ہے، انھیں سیاسی موضوعات پر ہی بات کرنا چاہیے، ان کے مسلم آئی کون اور مفتی و مبلغ بننے میں ملت کا نقصان ہی نقصان ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا نے ان کے اندر صلاحیتیں رکھی ہیں اور وہ ملت کی قیادت کر سکتے ہیں، اگر وہ مطلوبہ تبدیلیوں کے ساتھ زمینی سیاست پر آمادہ ہو جائیں تو ملت کی اکثریت ان کے پیچھے چلنے کو تیار ہوگی، میں بھی اس موقع پر جذباتی مضمون لکھ سکتا تھا اور جذباتی رائے دے کر حصہ داری کی اندھا دھند وکالت کر سکتا تھا، مگر نہ اس کی عادت ہے اور نہ کسی کے زیر اثر یا بعض بڑے قلم کاروں کی طرح کسی کے مطالبہ پر لکھنے کی عادت ہے، نہ ہی کسی کی واہ واہی کی خاطر یا کسی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے لکھنا پسند ہے۔

فی الحال مجھ سے پوچھیے تو میں یہی کہوں گا کہ اگر آپ ملک میں جمہوریت کے خاتمہ کا ذمہ دار ای وی ایم کو مانتے ہیں تو پھر اپنی اپنی پارٹیوں کو اس کے خلاف ملک گیر تحریک چلانے کے لیے تیار کیجیے، میرا ماننا ہے کہ جب تک ای وی ایم ہے تب تک بی جے پی رہے گی، دہلی کی مثال مت دیجیے، دہلی یونین ٹیریٹری ہے، وہ بہر حال مرکزی حکومت کے ہاتھ میں رہتی ہے، اور اگر آپ کو لگتا ہے کہ فرقہ پرستی کا جادو چل نکلا ہے تو فکر کیجیے کہ ملک مکمل طور پر آر ایس ایس کی گود میں نہ جائے، کئی دہائیوں کا احتساب اس وقت نہیں بعد میں کیجیے گا مناسب وقت پر، احتساب کا موقع اور وقت مناسب نہ ہو تو فائدے سے زیادہ نقصان کا امکان رہتا ہے، انھوں نے بھی آپ ہی کو تختۂ مشق بنایا، یہ بھی آپ کو ہی بناتے ہیں، مگر ان کا قبضہ مکمل ہوا تو یہ وجود مٹائیں گے نہیں بلکہ تشخص کے ساتھ کھلواڑ کریں گے اور قہقہے لگائیں گے، ابھی وقت ہے مگر افسوس ہے وقت رہتے ہوئے نہ ہم یکجا ہو پاتے ہیں اور نہ کوئی لائحہ عمل تیار کر پاتے ہیں، ہمارا ردعمل بھی جذباتی ہوتا ہے اور ہماری پالیسیاں بھی جذباتیت کے ہی زیر اثر وجود میں آتی ہیں، کچھ دن ہم لکیریں پیٹتے ہیں، پھر حالات کے رحم و کرم پر جینے کے سہارے خاموش ہو جاتے ہیں، ملک بھر کے سنجیدہ لوگوں کے لیے غور و فکر اور منصوبہ سازی اور منصوبوں پر آزادانہ عمل درآمد کے لیے شاید دو تین سال کا وقفہ اور ہے، اس کے بعد کے حالات ممکن ہے سخت آزمائشی ہوں، ورنہ کم از کم آج کے جیسے تو نہیں ہوں گے۔ (ولا قدر اللہ)

☆☆☆

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

❑ مطالعۂ قرآن

اللہ کے محبوب بندوں کی خصوصیات

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِيْنَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْناً وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلاماً (٦٣)وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَقِيَاماً (٦٤)وَالَّذِيْنَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَاماً (٦٥)إِنَّهَا سَاءتْ مُسْتَقَرّاً وَمُقَاماً (٦٦)وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَاماً (٦٧) وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهاً آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَن يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَاماً(٦٨) يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَاناً(٦٩) إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صَالِحاً فَأُوْلَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُوراً رَّحِيْماً (٧٠)وَمَن تَابَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَاباً(٧١)وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَاماً (٧٢)وَالَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمّاً وَعُمْيَاناً(٧٣)وَالَّذِيْنَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَاماً(٧٤) أُوْلَئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَسَلَاماً(٧٥)خَالِدِيْنَ فِيْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرّاً وَمُقَاماً(٧٦)قُلْ مَا يَعْبَأُ بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَاماً (الفرقان)

(ترجمہ:رحمٰن __جل مجدہ __کے (پسندیدہ) بندے وہ ہیں جو زمین پر تواضع سے چلتے ہیں، اور ان سے جب جاہل و نادان منہ لگتے ہیں تو وہ سلامتی والی بات کرتے ہیں (صبر کرتے ہیں، طیش میں نہیں آتے)اور وہ اپنے پروردگار کی رضا کے لیے راتیں سجدہ اور قیام میں گزارتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے مالک: ہم سے جہنم کا عذاب ٹال دے، بیشک اس کا عذاب بڑا سخت ہے، یقیناً جہنم بدترین قیام گاہ، بدترین جگہ ہے، اور وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل و تنگی، اس کے درمیان درست طریقہ پر ان کا عمل ہوتا ہے، اور وہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے خدا کو نہیں مانتے، اور کسی کی جان نہیں لیتے، جس کو اللہ نے محترم قرار دے رکھا ہے اور جس کو مارنا حرام قرار دیا ہے، الا یہ کہ کسی

کا قتل کرنا قانوناً درست ہو، اور وہ بدکاری نہیں کرتے، اور جو بھی ایسا کرے گا اس کو اس کا عذاب بھگتنا ہوگا، قیامت کے دن اس کو بڑھا چڑھا کر عذاب دیا جائے گا، اور اس میں ذلت و رسوائی کے ساتھ ہمیشہ پڑا رہے گا، سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کرلیں، اور اپنے اعمال درست کرلیں، ان کی برائیوں کو (معاف کر کے) اللہ نیکیوں میں تبدیل فرما دے گا، اور اللہ بہت مغفرت فرمانے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے۔ اور جو بھی توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے، وہ اللہ کی طرف ہی رجوع کرتا ہے، اور وہ (بندگان خدا) غلط باتوں اور غلط کاموں میں شریک نہیں ہوتے، اور جھوٹی گواہی نہیں دیتے، اور جب فضول اور بے ہودہ مجلس وغیرہ سے گزرتے ہیں، تو اپنے کو بچاتے ہوئے شریفانہ طور پر گزر جاتے ہیں، اور انہیں جب اپنے پروردگار کی آیات کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو اندھے بہرے ہو کر ان پر نہیں گرتے، (غور وتدبر سے کام لیتے ہیں، عمل کے لیے سمجھنا چاہتے ہیں اور سمجھ کر عمل کرتے ہیں) اور وہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنی بیویوں، اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما، اور ہمیں پرہیزگاروں میں آگے رہنے والا بنا، (اچھے لوگوں کی پیشوائی عطا فرما)۔ ان کو ان کے صبر کی وجہ سے جنت کے بالا خانے عطا کئے جائیں گے، اور وہاں ان کا استقبال زندگی اور سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ ہوگا، وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہ بہترین جگہ اور بہترین قیام گاہ ہے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں دعوت نہ دی جارہی ہوتی تو میرا رب تمہاری کچھ پرواہ نہ کرتا، تم نے (رسول کو، اور قرآن کو) جھٹلایا ہے، اس لیے عذاب تمہاری جان سے چمٹ کر رہے گا۔ (تم اس سے پیچھا نہ چھڑا سکو گے)۔

تمہید:

سورہ فرقان بھی مکی سورتوں میں سے ہے، اس کے مضامین بھی عام طور پر مکی سورتوں کی طرح ہیں، توحید اور اس کے دلائل کے ساتھ مظاہر قدرت کو بیان کیا گیا ہے، خاص طور پر اس سورہ میں حضور اکرم ﷺ کی نبوت ورسالت کا اثبات کیا گیا ہے، کفار ومشرکین کے باطل اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں، ان کے جرائم کی سزا کا تذکرہ کیا گیا ہے، سورہ کے آخر میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر کوئی گردش روز وشب میں غور وفکر کرے معرفت خالق تک پہنچنا چاہے تو خود کائنات کے تکوینی نظام میں بے شمار مظاہر قدرت الٰہی اور دلائل توحید موجود ہیں۔ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُوراً﴾ (الفرقان: ٦٢)

ان سب وضاحتوں کے باوجود بھی جو لوگ منکر رہے، ان پر عذاب کا تذکرہ کیا گیا، لیکن جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور مکہ مکرمہ میں چھوٹی سی اقلیت میں ہونے اور باجود تمام مصائب کے اپنے آپ کو با اعتبار اعمال و اخلاق رسول اللہ ﷺ کی مرضی کے تابع کر کے نہ صرف رسالت محمدی پر اپنے مکمل ایمان کا اعلان کیا بلکہ اپنے آپ کو نبی کی مرضی کے مطابق ڈھال کر اپنا مکمل تزکیہ کرلیا، ایسے کامل ومکمل اور مزکی ومصفی بندوں کی خصوصیات کا ذکر عباد الرحمٰن کے عنوان سے فرمایا گیا۔

(جاری.....)

☆☆☆

□ گوشۂ سیرت

رسول اللہ ﷺ کی بے مثال زندگی

ابوفہد، نئی دہلی

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں اور ہر پہلو ہر طرح سے روشن، تابناک اور متاثر کرنے والا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو خلعت نبوت سے تو چالیس سال کی عمر میں سرفراز کیا گیا مگر جس زندگی کو اللہ کی طرف سے اسوہ حسنہ کا تمغہ امتیاز ملا، اس میں رسول اللہ ﷺ کی ماقبل نبوت والی زندگی بھی اسی طرح شامل ہے۔ اس زندگی کے بھی بڑے نمایاں اوصاف ہیں اور اس میں بھی بے شمار خوبیاں اور اچھائیاں ہیں، اسی زندگی میں رسول اللہ ﷺ صادق وامین کے القاب سے پکارے گئے اور شہر مکہ و اطراف مکہ میں موجود تمام قبائل کے مردوں، عورتوں، جوانوں اور بچوں سب کے لیے ہر دلعزیز اور محبوب بن گئے۔ یہاں تک کہ زندگی کے ہر معاملے میں اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ کی ذہانت، امانت اور صداقت کا برملا اعتراف کیا۔ ہر مشکل وقت میں ان کی نگاہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف ہی اٹھتی رہیں۔ کعبے کی از سر نو تعمیر کا واقعہ تو سیرت کے اہم واقعات میں سے ہے، جب ایک طے شدہ بات کے مطابق رسول اللہ ﷺ صبح سویرے سب سے پہلے کعبہ پہنچ گئے، اور پہلے پہنچنے کی شرط کے مطابق اختلافی مسئلے میں حکم قرار پائے تو جس نے بھی دیکھا اور سنا کہ کعبے کی تعمیر میں حجر اسود کی تنصیب کے لئے محمد بن عبد اللہ حکم قرار پائے ہیں تو اس کی باچھیں کھل اٹھیں۔ اور ہر ایک نے خوشی کا اظہار کیا۔ کوئی ایک آواز بھی ایسی نہ تھی، یہاں تک کہ سرگوشی بھی نہ تھی جس سے یہ اشارہ ملتا کہ کہیں نہ کہیں رسول اللہ کی ثالثی پر اتفاق نہیں ہے یا ناراضگی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نبوت سے پہلے اپنے سماج میں اور آس پاس کے ماحول میں پوری طرح گھلے ملے ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے معاشرے سے دور رہ کر اور کٹ کر زندگی نہیں گزاری، البتہ آپ ﷺ کی کچھ ترجیحات تھیں اور کچھ اصول تھے، جو آپ ﷺ کو دیگر شرفائے مکہ سے ممتاز کرتے تھے اور آپ ﷺ کی زندگی کی گاڑی بالکل ہی الگ پیٹرن پر چل رہی تھی۔ انہی ترجیحات کے باعث ایسا ہوتا تھا کہ آپ ﷺ خیر اور بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور برائی وفحاشی کی باتوں اور کاموں سے پرہیز کرتے تھے۔ جب لوگ لہو ولعب میں مشغول ہوتے تو رسول اللہ ﷺ غور وفکر میں محو رہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی بنیادی سوچ اور فکر کائنات کے بارے میں تھی، کائنات کے پیدا کرنے والے کے بارے میں بھی اور خود انسان کے مقصدِ وجود کے تعلق سے بھی تھی۔ اپنی اسی غور وفکر کی عادت کی بنا پر رسول اللہ ﷺ بستی کے شور وہنگامے سے دور ایک پہاڑی پر چلے جاتے اور وہاں کئی کئی گھنٹے اور بعض اوقات کئی کئی دن اور راتیں گزارتے تھے۔

اللہ نے رسول ﷺ کو ظاہری حسن وخوبی سے بھی خوب

نوازا تھا اور ذاتی کمالات و کسبی امتیازات سے بھی خوب مالا مال کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ خوب صورت بھی تھے اور خوب سیرت بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے حسن اخلاق کی گواہی خود اللہ نے دی ہے، فرمان ہے: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم،4:68) ''بیشک آپ اعلیٰ اخلاق و کردار والے ہیں'' اور صرف گواہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تمام بنی نوع انسانی کو عام طور پر اور اہل ایمان کو خاص طور پر ہدایت بھی دی کہ وہ بھی ایسے ہی اخلاق و کردار کے حامل بنیں۔ فرمایا: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ لله اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ''اے لوگو! رسول اللہ کی ذات تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے'' رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کریمانہ کی شہادت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی اس بات کی شہادت دی کہ ان کی زندگی کا مقصد عالم انسانی کو اعلیٰ اخلاق سے روشناس کرانا ہے۔ فرمایا: إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ (رواہ البخاری فی الأدب المفرد) ''میں اللہ کے بندوں کو اخلاق کی اعلیٰ تعلیم دینے کے لیے آیا ہوں'' پھر رسول اللہ ﷺ دل و جان سے یہی چاہتے بھی تھے، اسی لیے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں ہمیشہ دست بدعا رہتے تھے اور اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو جس ظاہری و جسمانی خوبی یعنی حسنِ صورت سے نوازا تھا، اسی کا حوالہ دے کر اللہ سے عرض کرتے تھے، ایا اللہ! جس طرح تو نے مجھے ظاہری حسن سے آراستہ کیا ہے اسی طرح مجھے باطنی حسن سے بھی آراستہ فرما۔ یہ دعا گویا آپ ﷺ کیلئے دن رات کا وظیفہ تھی: اَللّٰهُمَّ حَسَّنتَ خَلْقِي فَحَسِّن خُلُقِي (رواہ ابن حبان) ''اے اللہ! تو نے میری تخلیق بہترین ساخت پر کی ہے، میرے اخلاق و کردار کو بھی اچھا کر دے۔''

رسول اللہ ﷺ کی زندگی انسانی معاشرے کے لیے سراپا رحمت تھی اور آپ ﷺ کی زندگی کے اس پہلو کا سب سے اہم اور بڑا حوالہ قرآن کا وہ بیان ہے جس میں اللہ نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد واضح کیا ہے، فرمایا: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء) ''اے رسول! ہم نے تمہیں تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''

اسی لیے ایسا تھا کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ رحم دل، سب سے زیادہ محبت کرنے والے، سب سے زیادہ شفقت فرمانے والے، اور سب سے زیادہ معاف کر دینے والے تھے۔ بادشاہوں کی اور عام انسانوں کی طبیعت اور مزاج تو یہی ہے کہ وہ جب بھی کسی پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں تو اس سے انتقام لیتے ہیں، ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہے، اور یہ کل بھی ہوتا ہے، جس کل کے بارے میں آج کے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ غیر متمدن اور غیر مہذب زمانہ تھا۔ اور یہ آج بھی ہو رہا ہے اور تہذیب و تمدن کی بلند بانگ دعویداریوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں اس کے بالکل ہی برعکس کردار ادا کیا، جب بھی آپ ﷺ نے کسی پر غلبہ حاصل کیا اسے معاف ہی کر دیا۔ زندگی کے پہلے حصے میں یہ انفرادی سطح پر ہوا مگر آخری حصے میں ریاستی سطح پر اور ملک گیر پیمانے پر ہوا۔ اور رسول اللہ ﷺ کے معافی دینے والے کردار کی سب بڑی شہادت فتح مکہ کے روز سامنے آئی، جب رسول اللہ ﷺ کے پاس طاقت تھی، فوج تھی اور دشمن زیر تھا۔ برسوں کے دشمن آج گھروں میں اور بیت اللہ میں دبک کر بیٹھ گئے تھے اور خوف سے لرز رہے تھے، آپ ﷺ چاہتے تو گزشتہ بیس سالوں کی تعذیب مسلسل کا بدلہ لیتے بلکہ اپنے سپائیوں کو بھی اجازت دیتے کہ وہ بھی ماضی کے ان زخموں کا پورا پورا حساب بے باق کر لیں جو اہل مکہ نے ہر ہر قدم پر دئے تھے، مگر قربان جائیے رسول رحمت ﷺ کی رحم دلی پر اور عام معافی دینے والے نبوی مزاج پر کہ اس انتقام کے دن بھی رسول اللہ ﷺ نے اس عام انسانی مزاج کے بالکل برعکس کردار ادا کیا اور عام معافی کا اعلان کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ ابھی مکہ کے دروازے پر ہی تھے اور ابھی پوری طرح فتح حاصل بھی نہیں ہوئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے علی الاعلان فرما دیا کہ آج انتقام کا دن نہیں بلکہ رحمتیں لٹانے کا دن

ہے۔ چنانچہ جب سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے فتح کے جوش میں کہا: یَا أَبَا سُفْیَانَ! الیَوْمَ یَوْمُ المَلْحَمَةِ، الیَوْمَ تُسْتَحَلُّ الکَعْبَةُ ''ابوسفیان! آج خونریزی کا دن ہے، آج کعبے کی حرمت حلال کردی جائے گی'' تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی سرزنش کی اور فرمایا: کَذَبَ سَعْدٌ، وَلَکِنْ هَذَا یَوْمٌ یُعَظِّمُ اللَّهُ فِیهِ الکَعْبَةَ، وَیَوْمٌ تُکْسَی فِیهِ الکَعْبَةُ (رواہ البخاری) ''سعد نے جھوٹ کہا، آج تو اللہ کعبے کو عظمتیں عطا فرمائے گا، آج تو کعبے کو لباس پہنایا جائے گا'' آج تو رحمت وشفقت کا دن ہے، آج تو کعبے کی عظمت بحال کی جائے گی۔

پھر جب اہل مکہ سرنگوں ہوگئے اور بنا کسی بڑی لڑائی کے مکہ فتح ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ کے سرداروں کو مخاطب کرکے پوچھا کہ تم مجھ سے کیا توقعات رکھتے ہو، انہوں نے رحم اور رعایت کی بات کہی تو رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا جاؤ! تم سب آزاد ہو۔ آج تم سے کچھ بھی مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا۔ فرمایا: لَاتَثْرِیبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْم ط اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ۔

رسول اللہ ﷺ کے یہی وہ اخلاق کریمانہ تھے جن کی گواہی بہت ہی قریبی لوگوں نے بھی دی اور دور دراز کے لوگوں نے بھی دی، دوستوں نے بھی دی اور دشمنوں بھی دی۔ رسول اللہ ﷺ کی شریک حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ قریب اور کون ہستی ہوسکتی ہے، جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو رفاقت کے لئے پسند فرمایا تو اس کی یہی علت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق بڑے کریمانہ ہیں اور آپ بہت ہی سچے انسان ہیں۔ فرمایا: اِنِّیْ قَدْ رَغِبْتُ فِیْكَ لِحُسْنِ خُلُقِكَ وَ صِدْقِ حَدِیْثِكَ ''مجھے آپ اس لیے اچھے لگے کہ آپ کے اخلاق وکردار بڑے عالی ہیں اور آپ بہت سچے انسان ہیں'' اور ایک اور موقع پر جب پہلی وحی نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ بہ تقاضائے بشریت اپنی جان پر خوف محسوس کرنے لگے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جن الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کو دلاسہ دیا اور جن صفات کے حوالے سے دیا، وہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کریمانہ کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ ان کے الفاظ تھے: کَلَّا وَاللّٰهِ مَا یُخْزِیْكَ اللّٰهُ اَبَدًا، اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَحْمِلُ الْکَلَّ، وَتَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ، وَتَقْرِی الضَّیْفَ، وَتُعِیْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ (بخاری ومسلم)

''خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی بھی رسوا نہیں کرے گا۔ آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں، بے کسوں کو مال وزر سے نوازتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کا ابوجہل سے بڑا دشمن شاید ہی کوئی رہا ہو مگر جب اس سے تنہائی میں پوچھا گیا کہ محمد کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے، وہ جھوٹے ہیں یا سچے؟ تو اس نے برملا کہا۔ ''خدا کی قسم محمد سچے ہیں انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ابوجہل چونکہ رسول اللہ کی طرف جھوٹ کی نسبت نہیں کرسکتا تھا، کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا تو لوگ خود اسے جھوٹا کہتے، لوگ کہتے کہ ابوالحکم تم محمد کو کیسے جھوٹا کہہ سکتے ہو، ہم نے تو کبھی بھی انہیں جھوٹ بولتے ہوئے نہیں سنا۔ اس لیے اس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف جھوٹ کی نسبت نہیں کی، البتہ رسول اللہ ﷺ کے دین کو ماننے سے انکار کردیا۔ ناجیۃ بن کعب کہتے ہیں کہ ابوجہل نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: لَا نَتَّهِمُكَ وَلَا نُكَذِّبُكَ، وَلٰكِنَّا نُكَذِّبُ الَّذِی جِئْتَ بِهٖ (تفسیر بغوی، الانعام:33)

''ہم آپ پر تہمت نہیں لگاتے، نہ ہی آپ کو جھوٹا سمجھتے ہیں، مگر ہم اس دین کا انکار کرتے ہیں جو آپ لے کر آئے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کی امانت داری کا سب سے بڑا ثبوت ہجرتِ مدینہ سے ٹھیک ایک دن پہلے کا وہ واقعہ ہے جب مکہ کے تمام قبائل نے (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کا رازدارانہ منصوبہ بنایا اور رات کی تاریکی میں رسول اللہ ﷺ کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس وقت بھی رسول اللہ کے پاس اہل مکہ کی امانتیں رکھی ہوئی تھیں۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے اس صورت میں بھی گوارہ نہ کیا کہ لوگوں کی امانتوں میں خیانت

کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو مدینے میں اسی غرض سے چھوڑ دیا کہ وہ سب لوگوں کی امانتیں انہیں لوٹا دیں اور پھر ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری تیئس سال بہت ہی ہنگا خیز سال رہے ہیں۔ جب قرآن نازل ہونا شروع ہوا، پھر اس کے معا بعد دعوت وتبلیغ کا کام شروع ہوا۔ دوست دشمن بن گئے اور کل تک ساتھ رہنے والوں نے آنکھیں پھیر لیں، مکہ کے تمام افراد نے رسول اللہ ﷺ سے اور ان کے گھر والوں سے بات کرنا تک چھوڑ دیا، یہاں تک کہ مقاطعہ کیا گیا اور تین سال کے طویل عرصے تک اہل ایمان کے مٹھی بھر افراد کو بستی سے دور بے سروسامانی کے عالم میں شعب ابی طالب میں گزارنے پڑے، وہ بھی اس طرح کہ کھانے پینے کی چیزیں بھی دستیاب نہیں تھیں۔ کئی ساتھی بھوک کی شدت کی تاب نہ لا سکے اور ابدی نیند سو گئے۔ تین تین بار ہجرت کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں، لڑائیاں ہوئیں، معاہدے ہوئے اور صلح ہوئی، شکست وفتح سے گزرنا پڑا۔ میدانِ جنگ میں وہ وقت بھی آیا جب ایک ہی خاندان کے دو افراد آمنے سامنے آ گئے، باپ کے سامنے بیٹا اور بیٹے کے سامنے باپ تلوار لیے میدان میں اتر آیا۔ جب لالچ دیا گیا اور جان سے مارنے کی پلاننگ تک کی گئی۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے تائید غیبی، اپنی بے پناہ ذہانت، صبر واستقامت، حسن معاملہ اور تدبیر وحکمت کے بل بوتے پر بد سے بدترین حالات کو بھی اپنے موافق کرنے میں کامیابی حاصل کی، یہاں تک کہ مکہ فتح ہوا اور سارا کا سارا عرب رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں آ گرا۔ مگر حیرت زدہ کرنے والی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی ہنگامہ خیز زندگی میں بھی متضاد اعمال وافعال کو جمع کر دیا، رسول اللہ ﷺ نے انہی ہنگامہ خیز دنوں میں عبادت وریاضت میں کچھ بھی کمی واقع ہونے نہیں دی، بلکہ عبادت بھی اس طرح دلجمعی کے ساتھ کی کہ کوئی دوسرا فارغ البالی اور فرصت کے اوقات میں بھی اتنی دلجمعی اور دلچسپی کے ساتھ عبادت نہیں کر سکتا، رسول اللہ ﷺ نماز میں بعض اوقات اتنی دیر تک کھڑے رہتے تھے کہ پاؤں مبارک پر ورم آ جاتا تھا۔ ایک طرف جہاد کی مشغولیت بھی درپیش ہے، قرآن بھی نازل ہو رہا ہے، اسے محفوظ کرنے اور یاد رکھنے کی بھی فکر ہے، اطراف کے بستیوں سے اور ممالک سے وفود بھی آ رہے ہیں، ان سے ملاقاتیں بھی ہو رہی ہیں، دین کی تعلیم بھی دی جا رہی ہیاور تبلیغ بھی ہو رہی ہے، بادشاہوں کو خطوط بھی لکھے جا رہے ہیں، اسفار بھی درپیش ہیں، شادی ونکاح کی محفلیں بھی ہیں اور غم واندوہ کے واقعات بھی ہیں، شہداء کی نمازیں پڑھی جا رہی ہیں اور تدفین ہو رہی ہے، لوگوں کے آپسی معاملات کا اور جھگڑوں کا نپٹارا بھی کیا جا رہا ہے۔ گھر سے لے کر ممبر ومحراب تک اور ممبر ومحراب سے لے کر میدان جہاد تک ہر جگہ اور ہر مقام پر رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس قیادت فرما رہے ہیں اور امامت کر رہے ہیں۔ اور پھر اس ساری ہنگامہ خیز زندگی کے پہلو بہ پہلو مکمل سکون اور تخلیے والی زندگی بھی ہے، جس میں اللہ سے راز ونیاز کی باتیں ہو رہی ہیں، آنسو بہائے جا رہے ہیں اور اللہ کی بارگاہ عالیہ میں اپنے سر کو اس طرح ڈال دیا گیا ہے جیسے اٹھانا ہی بھول گئے ہوں، جیسے فرصت ہی فرصت ہے اور وقت ہی وقت ہے۔ اور پھر جیسے جیسے باہر کی ذمہ داریاں بڑھتی جا رہی ہیں عبادت وریاضت میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ زوجہ رسول ﷺ حضرت عائشہؓ کو ترس آتا ہے اور وہ سوال کرتی ہیں۔ اے اللہ کے رسول ﷺ آپ اتنی ریاضت کیوں کرتے ہیں آپ کو تو اللہ نے مغفرت کا پروانہ عطا فرما ہی دیا ہے، تو رسول اللہ ﷺ بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ فرماتے ہیں: أَفَلَا أَكُونَ عَبْدًا شَكُورًا (رواہ البخاری ومسلم) ''کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''۔

رسول اللہ ﷺ نے جنگیں بھی لڑیں بلکہ مجاہدین کی قیادت بھی کی مگر یہ بھی اپنے آپ میں بڑا اہم پہلو ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک سے کبھی بھی کوئی قتل نہیں ہوا، نہ میدان جنگ میں اور نہ ہی آپس کی خاندانی لڑائیوں میں۔

☆☆☆

□ گوشۂ سیرت

سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سماجی پہلو

عبدالرشید طلحہ نعمانی

اگر ہم مسلمان ہیں، کلمۂ لاالہ الا اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اپنے آپ کو امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کا فرد سمجھتے ہیں تو ذرا بتائیں کہ ہمارے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟

کوئی عزیز دوست؟ کوئی عظیم فلسفی؟ کوئی خاندانی بزرگ؟ کوئی معروف رئیس؟ کوئی فاقہ مست درویش؟ کوئی مرشد کامل؟ کوئی شاعر خوش گلو؟ کوئی ادیب باکمال؟ کوئی خطیبِ شعلہ بار، کوئی ماہر فن کار؟ کوئی قریبی رشتے دار؟

نہیں! ہرگز نہیں.....اس کائنات کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جسے خدا تعالی نے آخری نبی بنا کر بھیجا، جس نے انسانیت کی رہبری ورہنمائی کے ذریعہ ایک مثالی معاشرہ تشکیل دیا، جس نے امداد باہمی اور تعاون وتناصر کی بجھتی قندیلوں کو فروزاں کیا اور قیامت تک آنے والی نسل آدمیت کو سماجی حقوق وفرائض سے آگاہ کیا۔ رسول خدا ﷺ بشر تھے، اور بہ حیثیت بشر حسنِ اہتمام کے ساتھ آپ نے وہ تمام ذمہ داریاں نبھائیں جس کا ایک انسان کامل کے سلسلے میں تصور کیا جاسکتا ہے۔ آپ کی حیات طیبہ کے مختلف ومتنوع پہلوؤں میں ہر پہلو کی طرح سماجی زندگی کا پہلو بھی نہایت روشن وتاب ناک ہے۔

تاریخ کے صفحات میں سیرت طیبہ کے یہ اوراق آج بھی جگمگا رہے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ جہاں ایک طرف کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے پیوند لگا لیا کرتے، گھر میں خود جھاڑو دے لیتے، بکریوں کا دودھ اپنے ہاتھ سے دوہ لیتے، جوتا مبارک پھٹ جاتا تو اس میں خود ٹانکا لگا لیتے، کنویں کے ڈول کو خود ہی سی لیا کرتے اور اونٹوں کے لیے چارہ پانی کا نظم خود فرمالیتے؛ وہیں دوسری طرف پڑوسیوں کا حق بھی ادا فرماتے، بیمار کی عیادت فرماتے، مظلوم کی حمایت فرماتے، مہمانوں کی ضیافت فرماتے، یتیموں کی کفالت فرماتے، بیواؤں اور مفلوک الحالوں کی مدد کرتے، ایک دفعہ آپ صحابہؓ کے ہمراہ کسی سفر پر تھے، آرام کے لیے ایک جگہ پڑاؤ کیا، صحابہؓ نے کھانا پکانے کے لئے ایک بکری ذبح کی اور کام آپس میں بانٹ لیے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ ''جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر کے میں لاؤں گا۔'' صحابہؓ نے نہایت احترام سے درخواست کی کہ ہم خود لکڑیاں بھی لے آئیں گے آپ زحمت نہ کیجئے؛ مگر رحمۃ للعالمین ﷺ نے فرمایا ''میں امتیاز پسند نہیں کرتا۔''

ذرا وہ وقت بھی یاد کیجیے! جب رسول اللہ ﷺ پر ابتدائی وحی نازل ہوئی، آپ غار حرا میں تھے کہ جبریل علیہ السلام کی آمد ہوئی۔ حکم ہوا، 'اقرأ'، پڑھو۔ جواب میں فرمایا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ جبریل نے پکڑا، پکڑ کر بھینچا اور کہا، 'اقرأ'، پڑھو۔ آپ نے جواب ارشاد کیا، میں پڑھا ہوا نہیں۔ تیسری بار بھی یہ سوال جواب ہوا اور پھر وحی مکمل ہوئی: ''پڑھ اپنے پروردگار کا نام لے کر جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو خون کے جمے لوتھڑے سے۔ پڑھ، اور تیرا رب بہت باعزت (اور کرم فرما) ہے۔ جس نے

سکھایا قلم کے ذریعے سے۔ سکھایا انسان کو جو وہ نہ جانتا تھا۔'' (سورہ علق ۱۔۵) اس وحی سے آپ اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ کانپنے لگے۔ گھر پہنچ کر کمبل اڑھانے کو کہا۔ حضرت خدیجہ نے آپ کی ڈھارس بندھائی اور یوں آپ کے محاسن کا ذکر کیا: ''نہیں! واللہ، خدا آپ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بے کسوں اور فقیروں کی مدد کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حادثات ومصائب میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔'' (بخاری)

حضرت خدیجہؓ نے اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کا ذکر کر کے جس طرح آپ ﷺ کو تسلی دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نبوت سے پہلے بھی سماجی و رفاہی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے نیز یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اچھے اخلاق اور اچھی خصلتیں انسان کو کسی بھی نقصان اور آفت میں پڑنے سے بچاتی ہیں اور حق تعالیٰ ان اوصاف ومحاسن کے طفیل امن وسلامتی عطا فرماتے ہیں۔

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک:

سماج ومعاشرے میں اہل خانہ اور قرابت داروں کے بعد سب سے پہلے جن کا حق ہے وہ پڑوسی ہیں۔'' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے حضرت جبریل علیہ السلام پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی ہمیشہ وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ میں گمان کرنے لگا کہ یہ اسے وراثت میں بھی شریک ٹھہرادیں گے۔'' (بخاری ومسلم)

حضرت ابوشریح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! وہ مومن نہیں، اللہ کی قسم! وہ مومن نہیں، اللہ کی قسم! وہ مومن نہیں۔ عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشار فرمایا: ''وہ شخص جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔'' (بخاری)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! فلاں عورت کا ذکر ہوتا ہے کہ وہ دن میں بہت زیادہ روزہ رکھتی ہے اور رات میں تہجد پڑھتی ہے، مگر اپنے پڑسیوں کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ عورت جہنمی ہے۔ اس شخص نے پھر کہا: اے اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! فلاں عورت کا ذکر اس کی قلت صوم وصلاۃ کے ساتھ ہوتا ہے، اور وہ پنیر کے ٹکڑے خیرات کرتی ہے، مگر وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہیں پہنچاتی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ جنتی ہے۔'' (ابن حبان)

مظلوم کی امداد:

ایک مستحکم سماج کے لیے یہ بات بھی نہایت ضروری ہے کہ وہاں انصاف کا بول بالا ہو، بہ حیثیت انسان سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے، زیادتی کرنے والے پر قدغن لگائی جائے اور مظلوم کی فریاد سنی جائے۔ عہدِ جاہلیت میں جب عرب میں ظلم وجور بہت بڑھ گیا، تو قریش کے چند قبائل عبد اللہ بن جدعان التیمی کے مکان پر جمع ہوئے اور آپس میں عہد کیا کہ مکہ میں جو بھی مظلوم نظر آئے گا، خواہ مکہ میں رہنے والا ہو یا کہیں اور کا، یہ سب اس کی مدد اور حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے، اور اسے اس کا حق دلوا کر رہیں گے۔ اس اجتماع میں رسول کریم ﷺ بھی شریک تھے اور بعد میں شرفِ رسالت سے مشرف ہونے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ ''میں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک ایسے معاہدے میں شریک تھا، کہ مجھے اس کے عوض سرخ اونٹ بھی پسند نہیں، اور اگر (دورِ) اسلام میں مجھے اس عہد وپیمان کے لئے بلایا جاتا تو میں لبیک کہتا۔'' (ابنِ ہشام) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کی تاریکیوں میں سے ہے''۔ (رواہ مسلم)

حاجت مندوں کی ضرورتوں کا خیال:

محتاجوں، غریبوں، یتیموں اور ضرورت مندوں کی مدد واعانت بھی سماج کی بنیادی ضرورت ہے۔ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف حاجت مندوں کی حاجت روائی کا حکم دیا؛ بلکہ عملی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ہمیشہ غریبوں، یتیموں، مسکینوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے۔ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں صحابہ کرام کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک عورت

اپنی کسی ضرورت کے لئے آپ کے پاس آئی، آپ صلی اللہ علیہ و سلم صحابہ کرام کے درمیان سے اٹھ کر دیر تک مسجد کے صحن میں اس کی بات سنتے رہے اور اس کی حاجت روائی کا یقین دلا کر، مطمئن کر کے اسے بھیج دیا۔ ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگشت شہادت اور بیچ والی انگشت مبارک سے اشارہ کیا۔ (بخاری)

راستے کے حقوق:

نبی پاک ﷺ نے معاشرے کو پر امن بنانے کے لیے مختلف حقوق کے ساتھ راستے کے حق کا اضافہ فرمایا اور اس بات کو یقینی بنانے کا حکم دیا کہ راستہ مسافروں اور آنے جانے والوں کے لیے مامون و محفوظ ہو اور انھیں دوران سفر کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، اس کے لیے کسی بھی تکلیف دہ چیز کو راستہ سے ہٹانا بھی ایک عبادت بتایا گیا؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان کے بہت سے شعبے ہیں ان میں پہلا کلمہ یعنی لا الہ الا اللہ اور آخری راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے۔ انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ ہے اور راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کا ہٹانا بھی صدقہ ہے۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ راستوں میں اور کھلی گزرگاہ میں مت بیٹھا کرو۔ بعض صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ ہمارے پاس تو گھروں میں جگہ نہیں ہوتی، کوئی دوست وغیرہ ملنے آجائے تو ہم باہر کھلی جگہ میں اس کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں یا راستے میں کسی جگہ پر اسے اپنے ساتھ بٹھاتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اگر گھر سے باہر کھلی گزرگاہ میں بیٹھنا ضروری ہو تو پھر راستے کا حق ادا کرو۔ صحابہؓ نے پوچھا: یہ راستے کا حق کیا ہے؟ جناب نبی کریمؐ نے راستے کے پانچ حقوق بیان کیے:

۱- نگاہیں نیچے رکھو اور آنے جانے والوں پر تانک جھانک مت کرو۔
۲- راستے میں اس طرح کھڑے ہو کر لوگوں کو اذیت مت دو کہ آنے جانے والوں کے لیے راستہ بند ہو جائے، اور اگر کوئی اذیت والی چیز راستہ میں دیکھو تو اسے ہٹا دو۔
۳- گزرنے والا مسلمان بھائی اگر سلام کرے تو اس کے سلام کا جواب دو۔
۴- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو یعنی راستے میں کوئی برائی ہوتے دیکھو تو اس کی ممانعت کا اہتمام کرو۔
۵- کوئی شخص راستہ گم کر بیٹھے تو اس کی راہنمائی کرو۔

خلاصۂ کلام:

جوں جوں معاشرہ ترقی کے منازل طے کر رہا ہے اور جیسے جیسے زندگی کی رفتار بڑھ رہی ہے ہمارے اردگرد بہت سی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ یہ تبدیلیاں نہ صرف ہمارے گرد و پیش کے ماحول پر؛ بلکہ ہمارے رویوں پر بھی اثر انداز ہو رہی ہیں۔ وقت کی تیز گامی نے انسان کو کمپیوٹر اور مشین بنا کر اس سے احساس کی گراں مایہ دولت چھین لی جو معاشرے کی اخلاقی ضرورت ہے، جس کے بغیر زندگی میں مسرت و خوشی مفقود ہے۔ کہنے والے نے سچ کہا کہ احساس وہ سچا جذبہ ہے جو ہمیں اپنی ذات سے ہٹ کر دوسروں کے بارے میں سوچنے اور اپنی تکلیف بھول کر دوسروں کی خوشی کے بارے میں سوچنے پر فوقیت دیتا ہے۔ اگر ہم اپنے اِردگرد نظر دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عجیب نفسانفسی کا دور ہے، ہر کوئی اپنی میں اور انا کی تسکین چاہتا ہے، ہر کوئی دوسرے سے آگے بڑھنے کا خواہاں ہے، ہر کسی کو اپنا قد بالا رکھنے اور اپنی دکان چمکانے کی فکر ہے؛ جس کی وجہ سے ہمارے اطراف بہت سے لوگ (پڑوسی، غریب، مظلوم، بیوا، یتیم وغیرہ) نظر انداز ہو رہے ہیں اور ان سے وہ تمام حقوق چھن رہے ہیں جو ان کی بنیادی ضرورت ہے۔ لہذا ہمیں آپ ﷺ کی سماجی زندگی کو سامنے رکھ کر اپنے طرز عمل میں تبدیلی لانے کی فکر کرنی چاہیے اور ایک صالح معاشرے کے وجود میں آنے کا سبب بننا چاہیے۔ کیوں کہ آپ کے انہی اخلاق فاضلہ اور صفات عالیہ کی روشنی سے ہر دور کے انسانی سماج کو منور کیا جا سکتا ہے، اور قیامت تک آنے والی انسانیت کو جادۂ مستقیم پر گامزن رکھا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

گوشۂ سیرت

سیرۃ النبی ﷺ اور مذہبی رواداری

مولانا ندیم احمد انصاری

رحمۃ للعالمین حضرت محمد ﷺ اس تاریک دنیا کو اپنے نورِ فیض سے منور کرنے کے لیے اس عالمِ رنگ و بو میں تشریف لائے اور آپ نے اپنے کردار و عمل سے گھٹا ٹوپ اندھیریوں کو روشنی سے بدل دیا، گو آج آپ کی تعلیمات پر جان بوجھ کر الزام تراشیاں کی جاتی ہوں، جب کہ دینِ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کی تعلیمات فطرت کے عین موافق و مطابق ہیں۔ اسلام نہ تو اپنے پیروکاروں پر اس قدر سختی کرتا ہے کہ ہر چیز کو حرام قرار دے کر انھیں دنیا سے کنارہ کش کر دے، اور نہ ہی ایسی آزادی کا علم بردار کہ اپنے متبعین کو تمام تر قیود سے آزاد کر بے مہار کھلا چھوڑ دے۔

اس وقت ہمارا موضوع ہے 'سیرۃ النبی ﷺ اور مذہبی رواداری' اور یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اسلام اور رسولِ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو دیگر تعلیماتِ حسنہ کے ساتھ مذہبی رواداری کا بھی عظیم پیغام دیا اور کُل انسانیت کے ساتھ حسنِ سلوک کی بھرپور تاکید کی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے :(مفہوم) اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد (باپ) اور ایک عورت (ماں) سے پیدا کیا ہے۔ (الحجرات) یعنی اس کائنات میں بسنے والے تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں، خواہ عرب میں رہنے والا ہو یا عجم میں، شہر میں رہنے والا ہو یا دیہات میں، بنگلے میں رہنے والا ہو یا جھونپڑی میں۔ خواہ کسی نسل و خاندان سے تعلق رکھنے والا اور کسی بھی زبان کا بولنے والا ہو، گورا ہو یا کالا ہو، ہیں سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور وہ بھی کیسے؟ ماں جائے اور باپ جائے بھائی، جن میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔

رحمۃ ﷺ نے آج سے تقریباً پندرہ سو سال قبل مذہبی رواداری کا پیغام دیا، وہ بھی ایسے وقت اور ایسی زمین پر، جہاں ایک انسان دوسرے انسان کے خون کا پیاسا ہوا کرتا تھا اور ذرا ذرا سی بات پر چھڑنے والی جنگیں چالیس چالیس سالوں تک چلا کرتی تھیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس سب کے باوجود اسلام کے متعلق نت نئی غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں اور اسلام دشمن پروپیگنڈے واویلا کرتے ہیں کہ اسلام نفرت و دشمنی کی تبلیغ کرنے والا مذہب ہے، بلکہ انھوں نے اپنے اس پروپیگنڈے کی ترویج واشاعت کے لیے قرآن مجید کی بعض آیات کے مفہوم کو توڑ مروڑ کر پیش اور حقیقت سے ناواقف لوگوں کے لیے تلبیس کا سامان کیا ہے۔ مستزاد یہ کہ ذرائع ابلاغ نے بھی اس پروپیگنڈے کے تلاطم خیز سمندر کو وسعت دینے میں اہم کردار ادا کیا، اور اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی اعتراف ہے کہ خود مسلمانوں کی معتد بہ تعداد اس سلسلے میں بعض غلط فہمیوں اور غلو آمیز تصورات کا شکار ہو گئی، اس لیے ضروری ٹھہرا ہے کہ ان تلبیسات کے پردے کو چاک کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

امتیاز کے باوجود حسنِ سلوک

یہ درست ہے کہ اسلام کی تاکید ہے کہ مسلمان اپنے دینی مزاج و خصوصیات اور اخلاقی صفات میں غیر مسلموں سے واضح طور پر ممتاز رہیں، ان کی نقالی سے پرہیز کریں اور خاص طور پر ان کی مذہبی نشانیوں اور رسومات سے اجتناب کریں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام ہر ذی روح کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

کرتا ہے اور انسان تو کجا، جانوروں تک سے سنگ دلانہ برتاؤ کو ناپسند کرتا ہے، اسی لیے رحمۃ للعالمین ﷺ نے انسانیت ہی نہیں بے زبان جانوروں تک سے حسنِ سلوک کی تاکید فرمائی ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں نے اپنے اونٹوں کے لیے ایک خاص حوض بنا رکھا ہے لیکن اس پر بسا اوقات بھولے بھٹکے جانور بھی آجاتے ہیں، اگر میں انھیں بھی سیراب کردوں تو کیا اس پر بھی مجھے ثواب ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں ہر پیاسے یا ذی روح کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔ (ابن ماجہ) اس باب میں رسولِ رحمت ﷺ کی اصولی تعلیم یہ ہے کہ **لا ضرر و لا ضرار** یعنی نہ خود تکلیف اٹھاؤ اور نہ ہی دوسروں کو تکلیف پہنچاؤ۔ (ابن ماجہ) اس ارشاد میں اس قدر عموم ہے کہ اس کے مطابق دوسروں کو تکلیف دینا جائز نہیں، خواہ وہ انسان ہو یا حیوان۔ رحمۃ للعالمین کے طرزِ عمل سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت ربیع بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، آپ اپنی کسی حاجت سے باہر تشریف لے گئے، ہم نے ایک سرخ پرندہ دیکھا جس کے ساتھ اس کے دو بچے بھی تھے، ہم نے ان بچوں کو پکڑ لیا تو وہ فرطِ غم سے ان کے گرد منڈلانے لگا۔ اتنے میں حضرت نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے اور یہ سب بہ تاکید ارشاد فرمایا: اس پرندے سے اس کے بچوں کو چھین کر کس نے اسے رنج پہنچایا؟ اس کے بچوں کو لوٹا دو۔ (ابوداؤد)

رواداری ہو دین بے زاری نہیں

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو رسول اور جو مذہب جانوروں تک کے حقوق کے سلسلے میں اس قدر رحیم و شفیق ہو، وہ انسانوں کے ساتھ کس درجے رحیم و شفیق ہوگا! ہاں یہ دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ 'اسلام میں رواداری کا مطلب، دین بے زاری ہرگز نہیں'۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: (مفہوم) ہم نے اُسے راستہ دکھا دیا، اب خواہ شکر گزار ہو، خواہ ناشکرا۔ (الدہر) اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے 'میثاقِ مدینہ' کے نام سے یہودی اور دیگر لوگوں سے جو معاہدہ کیا، وہ عالم کا پہلا ایسا منشور قرار پایا، جس میں انسانیت کے حقوق کا سب سے زیادہ پاس ولحاظ رکھا گیا تھا۔ اس معاہدے کے تحت مذہبی رواداری پر مبنی جو حقوق غیر مسلموں کو حاصل ہوئے ہمن جملہ ان کے دو یہ تھے: (۱) ایک یہ کہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کو بھی مذہبی و سیاسی سطح پر وہی حقوق حاصل ہوں گے، جو مسلمانوں کو حاصل ہیں (۲) دوسرے یہ کہ دونوں فریق مل کر دشمنوں سے اس امتِ متحدہ کی حفاظت کریں گے اور دونوں مل کر دفاعی اخراجات کی ذمّے داریاں اٹھائیں گے، اور اس اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو داخلی طور پر بھی کامل خود مختاری دی گئی، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: (مفہوم) عیسائیوں کو چاہیے کہ وہ انجیل کے مطابق فیصلہ کریں۔ (المائدہ)

یہی وجہ تھی کہ مدینہ منورہ میں ساری حکومت رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک میں آجانے کے باوجود آپ نے یہودیوں پر اسلام لانے کے لیے کوئی جبر نہیں کیا اور فتحِ مکہ کے موقعے پر بھی ایسی فراخ دلی کا مظاہر فرمایا جس کی مثال معلوم دنیا میں ملنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

رواداری و دل آزاری

اسلام نے ہمیشہ مذہبی رواداری کا سبق دیا اور مذہبی دل آزاری سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ربّانی ہے: (مفہوم) ان کو برا بھلا نہ کہو، جنھیں یہ لوگ اللہ کے ماسوا معبود بنا کر پکارتے ہیں۔ (الانعام) ہاں اس کے ساتھ یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ اسلام میں جہاں مذہبی دل آزاری سے منع کیا گیا ہے، وہیں برہان و دلائل سے حکمت کے ساتھ تنقید کرنا اور اختلاف کرنا، آزادیِ اظہار کے حق کے زمرے میں رکھا گیا اور مسلمانوں کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ اہلِ کتاب یا کسی بھی مذہب کے پیروکاروں سے جب گفتگو کی جائے تو تحمل اور رواداری کا مظاہرہ کیا جائے اور احسن انداز اپنایا جائے: (مفہوم) اہلِ کتاب سے مجادلہ نہ کرو مگر احسن طریقے سے۔ (العنکبوت) یعنی اسلام نہ تو کسی کی دل آزاری کی اجازت دیتا ہے اور نہ ایسی مذہبی رواداری کی کہ فریقِ مخالف کی ہر صحیح و غلط بات کو بلا چوں وچرا مان لیا جائے اور صلحِ کُل کا ایسا دعویٰ کیا جائے کہ اسلام کی اصل شناخت ہی باقی نہ رہے۔

رواداری کا بنیادی اصول

رواداری کے تعلق سے اللہ تعالیٰ نے یہ اساسی اصول مقرر فرمایا ہے: (مفہوم) دین میں کوئی جبر نہیں۔ (البقرہ) یہ اصول انسان کی آزادیِ فکر و عقیدے کا سب سے اہم اعلامیہ (چارٹر) ہے،

اس میں دوٹوک الفاظ میں یہ بات ارشاد فرمادی گئی کہ کسی بھی انسان کے لیے یہ جائز ہی نہیں کہ وہ جس بات کو خواہ دین سمجھ کر ہو، صحیح سمجھ رہا ہے، جبراً دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کرے، بلکہ ہر فرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس نظریے کو چاہے اختیار کرے۔ اس کا محاسبہ کرنے والی اصل ذات اللہ تعالیٰ کی ہے نیز اس بنا پر اسے بنیادی انسانی حقوق سے محروم بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: (مفہوم) اس لیے اے نبی آپ اس دین کی طرف دعوت دیجیے اور ثابت قدم رہیے، جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے اور کہہ دیجیے کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے اس پر میں ایمان لایا اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا اور تمھارا رب ہے، ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے، ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے، اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔ (الشوریٰ) ایک مقام پر ارشادِ ہے: تمھیں کسی قوم کی دشمنی اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کا رویہ اختیار نہ کرو، انصاف کرو۔ (المائدہ) دوسرے مقام پر فرمایا: (مفہوم) اگر اللہ تعالیٰ آپس میں لوگوں کا ایک دوسرے کے ذریعے دفاع نہ کرتا رہتا تو غیر مسلموں کے عبادت خانے، گرجے، مسجدیں اور یہودیوں کے معبد اور وہ مسجدیں بھی ڈھادی جاتیں جن میں اللہ کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے۔ (الحج) اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں میں مذہبی رواداری کے جذبات کو موجزن رکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے متعدد مسلم حکم راں گذرے ہیں جنھوں نے نہ صرف غیر مسلم عبادت گاہوں کی سرپرستی، ان کی تعمیر میں مدد کی بلکہ خود سے اس کی تعمیر بھی کرائی، جس کی مثالیں عہد اموی سے لے کر بادشاہ اورنگ زیب عالم گیرؒ تک ملتی ہیں۔

مختصر یہ کہ اسلام میں رواداری کا تصور یہ نہیں ہے کہ مختلف اور متضاد باطل خیالات کو درست قرار دے دیا جائے بلکہ اسلام کی رو سے مذہبی رواداری کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے عقائد یا اعمال ہمارے نزدیک غلط ہیں، ان کو ہم برداشت کریں، ان کے جذبات کا لحاظ کرکے ان پر ایسی نکتہ چینی نہ کریں، جو ان کو رنج پہنچانے والی ہو اور اُنھیں ان کے اعتقاد سے پھیرنے یا ان کے عمل سے روکنے کے لیے زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ اس قسم کے تحمل اور اس طریقے سے لوگوں کو اعتقاد و عمل کی آزادی دینا نہ صرف ایک مستحسن فعل ہے بلکہ مختلف الخیال جماعتوں میں امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے، لیکن اگر ہم خود ایک عقیدہ رکھنے کے باوجود محض دوسرے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے مختلف عقائد کی تصدیق کریں اور خود ایک دستور العمل کے پیرو ہوتے ہوئے، دوسرے مختلف دستوروں کا اتباع کرنے والوں سے کہیں کہ آپ سب حضرات برحق ہیں تو اس منافقانہ اظہارِ رائے کو کسی طرح رواداری سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، مصلحتاً سکوت اختیار کرنے اور عمداً جھوٹ بولنے میں آخر کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ (تفہیمات، بتصرف)

اعتدال ناگذیر

خلاصہ یہ کہ رواداری نہایت قابلِ تعریف صفت ہے مگر جس طرح ہر چیز اعتدال کے ساتھ ہی مفید ہوتی ہے، یہی معاملہ رواداری کا بھی ہے، اس لیے اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کسی حال میں بھی اس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ غور کیجیے اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ رحمٰن و رحیم اور ستار و غفار ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ قہار بلکہ شدید العقاب بھی ہے، جب تک وہ اپنی ستاری اور غفاری کا معاملہ کرتا ہے تو کفر اور شرک کو بھی برداشت کرتا جاتا ہے لیکن جب اس کی قہاری کا مظاہرہ ہوتا ہے تو بستیاں اور قوم کی قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔ انبیاے سابقین کی قوموں کی بداعمالی کے نتیجے میں ان کے ساتھ جو کچھ ہوا سب دنیا کے سامنے ہے۔ مختلف حالتوں اور موقعوں کے لیے مختلف صورتیں ہوتی ہیں اور کبھی انسانیت کی درستگی و اصلاح کے لیے مدبرانہ سختی بھی ناگذیر ہوتی ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کے ہاں نرم اخلاق بھی ہیں اور موقع و محل کی مناسبت سے سخت گیری بھی، جس کے نوعیت یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیتے اور اللہ کی حدوں کو توڑنے والوں کو معاف نہیں فرماتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے یہ جا لکھا ہے کہ اس دنیا میں سرگرم شجاعانہ قوتوں اور نرم اخلاق ان دونوں قوتوں کی ضرورت ہے اور دونوں کی جامع اور معتدل مثالیں صرف ہمارے پیغمبرِ اسلام میں مل سکتی ہیں۔ (خطبات مدراس)

(مضمون نگار الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن انڈیا کے ڈایریکٹر ہیں)

☆☆☆

❑ ناموس رسالت

توہینِ رسالت کا قضیہ

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
سکریٹری شریعہ کونسل، جماعت اسلامی ہند

تین ہفتے قبل ۱۶/اکتوبر ۲۰۲۰ء کی شام کو فرانس کے دار الحکومت پیرس کے شمال مغربی علاقے میں قتل کا ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک اسکول ٹیچر کو ایک اسٹوڈنٹ نے چاقو سے حملہ کر کے قتل کر دیا۔ خبروں میں بتایا گیا کہ یہ ٹیچر اپنے اسٹوڈنٹس کو پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کے توہین آمیز خاکے دکھاتا تھا۔ اس کے اسٹوڈنٹس میں مسلمان بھی تھے۔ انھوں نے اعتراض کیا۔ ان کے سرپرستوں نے بھی اسکول انتظامیہ سے شکایت کی لیکن ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ بالآخر ایک طالب علم اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا اور اس نے طیش میں آ کر اس ٹیچر کا کام تمام کر دیا۔

یورپی ممالک میں خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی اہانت و تذلیل کی کارروائیاں عرصہ دراز سے جاری ہیں۔ صلیبی جنگوں میں ذلّت آمیز شکست کا بدلہ لینے کے لیے مستشرقین (Orientalists) کی پوری فوج میدان میں آ گئی ہے۔ ان لوگوں نے سیرت کے موضوع پر ایسی کتابیں لکھیں جن میں پیغمبر اسلام کی پاکیزہ زندگی کو داغ دار کرنے اور شرم ناک انداز میں پیش کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی ہے۔ اس کے اثرات اب تک دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ آئے دن امریکہ، فرانس، ڈنمارک، ناروے اور دیگر ممالک میں ایسی مذموم حرکتیں سامنے آتی رہتی ہیں جو مسلمانوں کے اشتعال کا باعث بنتی ہیں۔

پانچ برس قبل 2015 میں فرانس کے مشہور اخبار 'چارلی ہیڈو' نے اس معاملے میں گستاخانہ جسارت کی تھی۔ اس نے پیغمبر اسلام کے اہانت آمیز کارٹونس شائع کیے تھے، جس پر پوری دنیا کے مسلمانوں نے غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔ اس موقع پر اخبار کی عمارت پر حملہ بھی ہوا تھا جس میں تین حملہ آوروں سمیت ادارتی عملہ کے بارہ افراد مارے گئے تھے۔ اس وقت سے آئے دن یہ موضوع گرم رہتا ہے۔ مذکورہ اخبار کی جانب سے ان کارٹونس کی دوبارہ اشاعت کی بات کہی جاتی ہے۔ بعض شر پسند اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے ان کارٹونس کو ذریعہ بناتے ہیں اور ان کے ذریعہ سماج میں انارکی، ابتری اور انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۶/اکتوبر کو پیش آنے والا مذکورہ واقعہ بھی اسی قبیل سے تھا۔

فرانس کے صدر ایمانویل میکروں کی اسلام دشمنی جگ ظاہر ہے۔ وہ متعدد مواقع پر اسلام کے خلاف کھلّم کھلا بیانات دے چکے ہیں۔ انھوں نے مذکورہ واقعہ پر بھی اپنے سخت ردِّعمل کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے پیغمبر اسلام کے متنازعہ اور تضحیکی خاکے بنانے کو 'اظہارِ رائے کی آزادی' قرار دیتے ہوئے اس کا دفاع کیا ہے اور تضحیکِ رسول میں ملوّث ٹیچر کے قتل کو 'اسلامی دہشت گردانہ حملہ' سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سخت گیر اسلام سے سب کو خطرہ ہے۔ فرانس میں بولنے، لکھنے، سوچنے اور خاکے بنانے کی سب کو آزادی ہے۔ اس پر قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔

مغربی ممالک کی جانب سے اظہارِ رائے کی آزادی کا دعویٰ بالکل کھوکھلا ہے، جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اس معاملے میں مغرب کا رویّہ منافقانہ اور اس کی پالیسی دوغلی ہے۔ کسی شخص کی آزادی کے حدود وہاں تک ہیں جہاں کسی دوسرے کو اذیت نہ پہنچے۔ انگریزی کہاوت ہے کہ تمھیں اپنے ہاتھ فضا میں لہرانے کی اجازت ہے مگر دوسرے شخص کی ناک سے پہلے تک۔ جو مغربی ممالک عیسائیت کے پیرو ہیں وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مذاق اڑانے کی اجازت نہیں۔ برطانیہ میں شاہی خاندان کا تمسخر ناقابلِ تعزیر جرم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں ہٹلر کی نازی افواج کے ہاتھوں لاکھوں یہودیوں کا قتل عام ہوا تھا جسے 'ہولوکاسٹ' (Holocaust) کہا جاتا ہے، اس کا انکار کرنا یا اسے مبالغہ آرائی قرار دینا جرم سمجھا جاتا ہے۔ پھر جس شخص سے دنیا کے ایک ارب ستّر کروڑ انسانوں کی محبت وعقیدت وابستہ ہو، اس کی اہانت کرکے انھیں اذیت پہنچانے کو آزادی اظہارِ رائے کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے؟

فرانس کے اس واقعے پر مختلف ردِّ عمل سامنے آئے ہیں۔ صدرِ ترکی رجب طیّب اردوان نے اپنے فرانسیسی ہم منصب کے بیان پر سخت نقد کرتے ہوئے کہا ہے کہ انھیں دماغی علاج کی ضرورت ہے۔ پاکستان اور ایران کے حکم رانوں نے بھی احتجاجی بیانات دیے ہیں اور مذمّتی قرار دادیں منظور کی ہیں۔ لیکن دیگر مسلم ممالک کے حکم رانوں کی جانب سے جس ردِّ عمل کی توقع تھی وہی پوری نہیں ہوئی۔ انھوں نے خاموشی کو ترجیح دی۔ البتہ پوری دنیا میں مسلم عوام نے زبردست طریقے سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے مختلف ممالک میں بڑے بڑے مظاہرے کیے اور جلوس نکالے جن میں پیغمبر اسلام کے توہین آمیز خاکوں پر اپنی شدید ناراضی اور آپؐ سے اپنی غیر معمولی محبت وعقیدت اور وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ ان کا یہ ردِّ عمل عین متوقع ہے۔ پیغمبرؐ سے محبت ایمان کا جز ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میری ذات اس کے نزدیک اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجائے'' (بخاری: ۵۱) کوئی مسلمان چاہے دین کے تقاضوں پر عمل نہ کرتا ہو اور محض نام کا مسلمان ہو، لیکن اس کے سامنے پیغمبر کی توہین کی جائے اور آپؐ کا مذاق اڑایا جائے تو وہ اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ اس موقع پر وہ ضرور غیظ و غضب سے بھر جائے گا اور اپنا آپا کھو بیٹھے گا۔

فرانس کے مذکورہ بالا واقعہ کے پس منظر میں مسلمانوں کی طرف سے مختلف رویّے سامنے آئے ہیں جو افراط وتفریط پر مبنی ہیں۔ انھیں قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آئندہ سطور میں ان کی وضاحت کی جائے گی۔

۱۔ بعض مسلم دانش وروں کی طرف سے یہ بات کہی گئی ہے کہ اسلام کے مخالفین پیغمبر اسلام کے بارے میں چاہے جتنی بدزبانی کریں، آپؐ کی اہانت اور تضحیک کے چاہے جیسے طریقے اختیار کریں اور تمسخر کا جو بھی حربہ اپنائیں، اسلام کے ماننے والوں کو مکمل اعراض کی روش اختیار کرنی چاہیے۔ وہ اس طرح بالکل خاموش رہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ مشورہ دینے والے اپنے مشورے میں چاہے جتنے سنجیدہ اور مخلص ہوں، لیکن یہ قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ یہ دینی غیرت وحمیّت، عدل و انصاف، تہذیب وشرافت اور عقل وفطرت کے خلاف ہے۔ انسان جس ہستی سے محبت کرتا ہے، اپنی نگاہوں کے سامنے اس کی بے توقیری دیکھے تو اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرسکتا۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کا معاملہ تو یوں بھی بے انتہائی حسّاس ہے کہ ہر مسلمان آپؐ کی عزت وعظمت پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے ہر دم تیار رہتا ہے۔

۲۔ بہت سے مسلمانوں کی جانب سے اس موقع پر اپنے بھرے ہوئے جذبات کے اظہار کے لیے ناشائستہ اور غیر اخلاقی طریقے اختیار کیے گئے ہیں مثلاً، سوشل میڈیا پر صدرِ فرانس کے لیے گھٹیا زبان استعمال کی گئی ہے، بھدّی گالیاں تحریر کی گئی ہیں، ایسے کارٹون بنائے گئے ہیں جس میں انسانی جسم پر کتّے کا سر لگا دیا گیا ہے۔ یہ اور اس طرح کی دیگر حرکتیں مسلم امّت کی اخلاقی زبوں حالی پر دلالت کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں اہلِ ایمان کو مشرکوں کے معبودوں تک کا تذکرہ برے اور ناشائستہ الفاظ میں کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ (الانعام: ۱۰۸) اللہ کے رسول ﷺ کی حیاتِ طیّبہ میں آپؐ کے ساتھ کیسی کیسی نازیبا حرکتیں کی گئیں لیکن آپؐ نے کبھی اپنے مخالفوں کے لیے گندے الفاظ کا استعمال نہیں کیا۔ عبداللہ بن ابی کی منافقانہ سرگرمیوں سے آپؐ

چھی طرح واقف تھے، لیکن اسے اس کے لقب سے پکارتے تھے جو احترام پر دلالت کرتا ہے۔

۳۔ مسلمانوں کی طرف سے اب تک جو ردِّ عمل سامنے آیا ہے اس پر جذباتیت غالب نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی اپنے پیغمبر سے محبت جذباتی ہے لیکن ساتھ ہی اس محبت کو شعوری بھی ہونا چاہیے۔ کسی شخص کو جس سے محبت ہوتی ہے اس کا بے دام غلام ہوتا ہے، اس کے اشاروں پر چلتا ہے اور اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن مسلمانوں کی اپنے پیغمبر سے یہ کیسی محبت ہے جو انھیں اس کی اطاعت پر آمادہ نہیں کرتی اور اپنی زندگیوں میں اس کی بتائی ہوئی تعلیمات کو نافذ کرنے پر نہیں ابھارتی۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کی خواہشات میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں۔'' (شرح السنۃ) اگر مسلمان اپنے احتجاجوں اور مظاہروں کے ذریعے اپنے رسول سے بے انتہا محبت کا اظہار کریں، لیکن ان کی زندگیوں میں اطاعتِ رسول کا جذبہ مفقود نظر آئے تو انھیں ضرور اپنا احتساب کرنا چاہیے۔

۴۔ پیغمبر اسلام کی توہین وتضحیک کے یہ واقعات مسلمانوں کو اپنے رب کی طرف پلٹنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ چھوٹے بچے کو چوٹ لگ جائے، کوئی تکلیف پہنچ جائے یا کوئی دوسرا بچہ اسے مار دے تو وہ فوراً بھاگ کر اپنی ماں کے پاس جاتا ہے اور اس کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح مسلمانوں کے دین وایمان پر حملے ہوں، ان کے شعائر، عقائد اور اقدار کا مذاق اڑایا جائے، یا ان کے محبوب پیغمبر کی اہانت کی جائے تو انھیں بھی فوراً اپنے رب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے مظاہر مسلمانوں کی زندگیوں میں نظر نہیں آتے۔ قرآن مجید میں اسی کی تعلیم دی گئی ہے۔ اللہ تعالی نے اپنے پیغمبر سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''پس (اے نبی!) جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔'' (طہ:۱۳۰، ق:۹۳)

۵۔ کسی بھی ناگفتہ بہ صورت حال پیش آنے پر مسلمانوں کا مطلوبہ رویّہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ آپے سے باہر نہ ہوں اور صبر کا مظاہرہ کریں۔ عہدِ نبوی میں کفار ومشرکین اللہ کے رسول ﷺ کی مخالفت میں بہت پُر جوش تھے۔ وہ طرح طرح کی سازشیں کرتے، منصوبے بناتے اور ان کو نافذ کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کی یاوہ گوئیاں بھی بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔ ہر موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو صبر کا دامن تھامے رکھنے کی تاکید کی: ''پس (اے نبی!) جس چیز کا تمھیں حکم دیا جارہا ہے اسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی پروا نہ کرو۔ تمہاری طرف سے ہم ان مذاق اڑانے والوں کی خبر لینے کے لیے کافی ہیں۔'' (الحجر:۹۴-۹۵) ''(اے نبی!) صبر سے کام کیے جاؤ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چال بازیوں پر دل تنگ ہو۔'' (النحل:۱۲۷) ''اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو اور شرافت کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ۔'' (المزمل:۱۰) یہی حکم اہلِ ایمان کو بھی دیا گیا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''(اے لوگو جو ایمان لائے ہو) تمھیں مال و جان دونوں کی آزمائشیں آکر رہیں گی اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔'' (آل عمران:۱۸۶)

یہ واضح رہے کہ صبر کا مطلب عاجزی، تن آسانی، بے بسی اور نامرادی نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے موقف پر جما رہے اور مخالفین کی پروا کیے بغیر اپنے مشن سے جڑا رہے۔

۶۔ پیغمبر اسلام کی پاکیزہ شخصیت پر جو تہمتیں لگائی جائیں اور دریدہ دہنی کے ساتھ جو غلط باتیں منسوب کی جائیں، مسلم اصحابِ علم کی ذمے داری ہے کہ ان کا شریفانہ اسلوب میں جواب دیں اور آپؐ کی تصویر کو مصفّٰی ومجلّٰی انداز میں پیش کریں۔ قرآن مجید نے یہی تعلیم دی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کو شاعر کہا گیا، کاہن کا لقب دیا گیا، اس کے جواب میں غیظ وغضب اور اشتعال پر مبنی اسلوب اختیار کرنے کے بجائے پوری سنجیدگی، متانت اور شائستگی کے ساتھ کہا گیا: ''یہ ایک رسولِ کریم کا قول ہے، کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو، اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے، تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو۔ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔'' (الحاقۃ:۴۰-۴۳) کفارِ مکہ نے لوگوں کو قرآن سننے سے روکنے کے لیے مختلف کھیل تماشے ایجاد کیے اور گانے بجانے والی عورتوں کو استعمال کیا۔ اس کے جواب میں اہلِ ایمان کو نصیحت کی گئی کہ وہ قرآن کا پیغام

زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کریں۔ دشمنوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی توہین وتضحیک کے لیے ہجو یہ شاعری کا سہارا لیا تو حضرت حسّان بن ثابت، حضرت عبداللہ بن رواحہ اور دیگر شعرا صحابہ میدان میں آئے اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی مدح وتوصیف پر مبنی شاعری کی، جس سے فنِ نعت کی بنیاد پڑی۔ آج اگر ایسی کتابیں لکھی جارہی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی پاکیزہ سیرت کو مسخ کرکے پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تو اہلِ اسلام کو ایسی کتابیں بڑی تعداد میں پیش کرنی چاہئیں جن میں آپؐ کی ذاتِ گرامی کا صحیح تعارف کرایا گیا ہو۔ آج اگر رسول اللہ ﷺ کی توہین وتضحیک کے لیے سوشل میڈیا کا سہارا لیا جارہا ہے تو مسلمانوں کو بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ سوشل میڈیا کے مختلف ذرائع کو اختیار کرنا چاہیے۔

۷۔ فرانس کے خلاف مسلمانوں کے ردِّ عمل کا اظہار یوں بھی ہوا ہے کہ اس کی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کی اپیلیں کی گئی ہیں۔ یہ اپیلیں بعض مسلم حکم رانوں، دینی تنظیموں کے سربراہوں اور نمایاں مذہبی شخصیات کی طرف سے کی گئی ہیں، اگرچہ انھیں قبولِ عام نہیں مل سکا ہے۔ اگر کسی ملک کی مصنوعات کا بائیکاٹ کرکے اس پر دباؤ ڈالا جاسکتا ہو تو اس حکمتِ عملی کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن موجودہ دور میں مختلف ممالک اور ان کی تجارتی کمپنیاں ایسے باہمی معاہدوں سے جڑی ہوتی ہیں جن کی موجودگی میں بائیکاٹ کو دباؤ ڈالنے کے لیے موثر تدبیر نہیں قرار دیا جاسکتا اور اس کی کام یابی کے امکانات بھی کم سے کم ہوتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت میں ہمیں دونوں طرح کے نمونے ملتے ہیں۔ ہجرتِ مدینہ کے کچھ عرصے کے بعد آپ نے کفارِ مکہ کی معاشی سرگرمیوں پر قدغن لگانے کے لیے ان کے تجارتی قافلے پر حملے کا منصوبہ بنایا جس کے نتیجے میں غزوہ بدر پیش آیا۔ دوسری طرف غزوہ موتہ میں خاصا جانی نقصان ہونے کے باوجود آپؐ نے شام، جس کی عمل داری میں موتہ کا علاقہ آتا تھا، کے معاشی مقاطعہ کی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔

۸- آخری اور سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ فرانس میں توہینِ رسول کا ارتکاب کرنے والے ٹیچر کے قتل کے واقعہ کو بہت سے مسلمانوں نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے اور قاتل طالب علم کے بارے میں تحسین وتوصیف کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہ صحیح اسلامی رویّہ نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ توہینِ رسالت قابلِ تعزیر جرم ہے۔ اسلامی ریاست میں رہنے والے کسی شخص کو خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ پیغمبر اسلام کی توہین کرے اور آپؐ کے بارے میں نازیبا اور غیر شائستہ کلمات کا اظہار کرے۔ اگر ایسا شخص نادانستہ طور پر اس حرکت کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے سمجھایا بجھایا جائے گا اور اس سے باز آنے کے لیے کہا جائے گا۔ اگر وہ اپنے اس گھناؤنے عمل پر اصرار کرے تو اس کا معاملہ عدالت میں لے جایا جائے گا اور مکمل عدالتی کارروائی کے بعد جرم ثابت ہونے پر اسے قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن اس معاملے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ سزا نافذ کرنا ریاست کا حق ہے۔ کسی شخص کو اپنے طور پر قانون کو ہاتھ میں لینے کا حق نہیں ہے۔ اسے یہ اختیار ہرگز نہیں دیا جاسکتا کہ جس شخص کو اپنی دانست میں توہینِ رسالت کا مرتکب سمجھے اسے اپنے ہاتھ سے قتل کردے۔ یہ عمل انارکی پیدا کرنے والا ہوگا۔ ایسا شخص چاہے جتنے پاکیزہ جذبات کے ساتھ یہ غیر قانونی عمل انجام دے، اسے قانون کے حوالے کیا جائے گا اور اسے قتل کی سزا دی جائے گی۔ بعض حضرات نے عہدِ نبوی کی کچھ مثالیں پیش کی ہیں اور ان کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی توہین کرنے والے متعدد افراد کو قتل کیا گیا۔ ان واقعات کے بارے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ وہ قتل اللہ کے رسول ﷺ کی ہدایت پر یا دوسرے الفاظ میں ریاست کے حکم سے کیے گئے۔ الّا ذُکّا واقعات جن میں بعض صحابہ نے مشتعل ہوکر رسول اللہ ﷺ کی توہین کرنے والوں کو قتل کردیا تھا، آپؐ نے ان کی تحقیق کروائی اور جرم ثابت ہونے پر ان کا خون رائیگاں قرار دیا۔ ان استثنائی مثالوں کو عمومی رنگ نہیں دیا جاسکتا۔

توہینِ رسالت کے واقعات پر مسلمانوں کو مشتعل ہوکر اپنا ردِّ عمل ظاہر کرنے کے بجائے صبر وتحمّل کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور اپنے تمام اعمال میں قرآن وسنّت سے رہ نمائی حاصل کرنی چاہیے کہ یہی مطلوب ہے اور یہی ان کے دین وایمان کا تقاضا ہے۔

☆☆☆

□ بحث و تحقیق

قصۂ غرانیق کا علمی وتنقیدی جائزہ

محمد خالد ضیا صدیقی ندوی
(امام بخاری ریسرچ اکیڈمی، علی گڑھ)

ہمارے تفسیری ذخیروں میں بعض ایسی بے سروپا روایتیں راہ پا گئی ہیں، جن کی وجہ سے مخالفین اسلام کو خواہ مخواہ اسلام پر اعتراض کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ مخالفین اسلام اگر اعتراض کرتے ہیں، تو بہت زیادہ حیرانی نہیں ہوتی کہ والشيء من معدنه لايستغرب ؛لیکن جب فرزندان اسلام فرزندان تثلیث کے نقش قلم کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں، اور اسلام کے چہرے سے داغ مٹانے کی خواہش میں اسلام کی بنیاد ہی کھودنے لگتے ہیں، تو حیرت وافسوس کے ملے جلے جذبات کا پیدا ہو جانا فطری ہے۔

قصۂ غرانیق ہی کو لے لیجیے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ واقعہ سنتے یا پڑھتے ہی زبان سے یہ نکل جاتا: سبحانک! هذا بهتان عظيم؛ لیکن پھر تسکین قلب وقلم کا سامان کیسے فراہم ہوتا؟ مستشرقین نے اپنے ناپاک مقاصد کے پیش نظر اس واقعے کو خوب اچھالا، اور اس کے ذریعے حدیث اور صاحب حدیث کے مقام ومرتبے کو کم کرنے کی کوشش کی؛ مگر افسوس کہ دور حاضر میں بعض مسلم اہل قلم اور متجددین نے بھی اس طرح کے خیالات کا اظہار کر کے استشراقی مشن کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

ایسے مسلم اہل قلم میں ایک نمایاں نام' صاحب ادراک زوال امت' کا ہے۔ انھوں نے بھی قصۂ غرانیق کو پیش کر کے سارے حدیثی ذخائر سے اعتماد اٹھانے کی کوشش کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''قرآن مجید جس شخص کے اسوے کو قابل اتباع بتاتا ہے وہ قرآنی بیان کے مطابق ایک ایسا رسول ہے جس کا بیان حق سے عبارت ہے: ﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى ﴾ اس کی راست بازی کی شہادت پر خود خدا گواہ ہے ﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَى﴾ ___ لیکن اس کے برعکس مأخذ سنت کے تاریخی بیان میں ہم ایک ایسے رسول کا تذکرہ پاتے ہیں جو ''وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى'' کی پاس داری نہیں رکھتا۔ شیاطین کے زیر اثر اس کی زبان سے ''تلك الغرانيق العلى ، إن شفاعتهن لترجى'' جیسے شرکیہ الفاظ کا صدور ہو جاتا ہے''۔ (ادراک زوال امت: ۱/۲۱۵)

اس روایت کے ذریعے صاحب تحریر نے اپنے اس خیال کو تقویت پہنچانا چاہا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی جو تصویر حدیثوں میں کھینچی گئی ہے، وہ اس تصویر سے بہت مختلف؛ بلکہ متضاد ہے، جو قرآن نے کھینچی ہے۔ پھر کیوں نہ ہم قرآنی اسوے کو لائق اتباع جانیں، اور حدیثی اسوے کو مسترد کر دیں؟!

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مقام ومنصب کو بیان کرنے والی بے شمار مضبوط روایات کی بہ جائے ایسی روایت کا سہارا کیوں لیا گیا جو انتہائی کمزور؛ بلکہ موضوع ہے؟ کیا ذخیرۂ سنت میں رسول اللہ ﷺ کی صحیح تصویر کھینچنے والی دوسری روایات موجود نہیں تھیں؟ جس روایت کے بارے میں امت کے محققین کا اجماعی فیصلہ ہے کہ وہ موضوع ، باطل اور

زندیقوں کی من گھڑت ہے، اسے بیان کرنے کا مقصد کیا ہے؟ کیا کوئی عقل مند انسان یہ باور کرسکتا ہے کہ کسی نبی سے شرکیہ الفاظ کا صدور ہو! ___ ہرگز نہیں۔ بتوں کی تعریف وہ بھی رسول کی زبان سے! وہ بھی سید الرسل کے زبان سے!! ناممکن ہے۔

روایت کا تنقیدی جائزہ لینے سے پہلے ''عصمت انبیا'' کے مسئلے پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے؛ کیوں کہ یہ روایت ''عصمت انبیا'' کو داغ دار کرتی ہے۔

عصمت انبیا کا مسئلہ

شیخ عبدالغنی عبدالخالق مصریؒ نے ''حجیۃ السنۃ'' میں اور علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ''سیرت النبی'' میں اس مسئلے پر بڑی نفیس، تفصیلی اور تشفی بخش گفتگو کی ہے، اور مخالفین کے شبہات کا ازالہ بھی کیا ہے۔ اہل علم کو وہاں رجوع کرنا چاہیے۔ ہم یہاں معارف القرآن (مفتی محمد شفیع صاحب عثمانیؒ) سے صرف ایک اقتباس نقل کرتے ہیں، جو اس مسئلے کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔

مفتی صاحبؒ لکھتے ہیں:

''انبیا علیہم السلام کی عصمت (تمام گناہوں سے) عقلاً اور نقلاً ثابت ہے۔ ائمۂ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیا علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں — وجہ یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے۔ اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف (خواہ گناہ کبیرہ یا صغیرہ) صادر ہوسکے، تو انبیا کے اقوال و افعال سے امن اٹھ جائے گا، اور وہ قابل اعتبار نہیں رہیں گے۔ جب انبیا ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے، تو دین کا کہاں ٹھکانا ہے! البتہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں متعدد انبیا کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عتاب بھی ہوا۔ ایسے واقعات کا حاصل باتفاق امت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی یا خطا و نسیان کی وجہ سے ان کا صدور ہوجاتا ہے۔ کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا۔ غلطی اجتہادی ہوتی ہے، یا خطا و نسیان کے سبب قابل معافی ہوتی ہے، جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جاسکتا۔ اور یہ سہو و نسیان کی غلطی ان سے ایسے کاموں میں نہیں ہوسکتی جن کا تعلق تبلیغ و تعلیم اور تشریع سے ہو؛ بلکہ ان سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا سہو و نسیان ہوسکتا ہے؛ مگر چوں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیا علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے، اور بڑوں سے چھوٹی سی غلطی بھی ہوجائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے، اس لیے قرآن حکیم میں ایسے واقعات کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اس پر عتاب بھی کہا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ گناہ ہی نہیں''۔

(معارف القرآن: ۱/ ۱۸۵-۱۸۶، سورۃ البقرۃ)

قصۂ غرانیق

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے اس قصے کی تفصیل کچھ یوں نقل کی ہے:

''اللہ کے رسول ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ آپ کی قوم آپ کو کسی طرح ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ خدا کے پیغام کو ٹھکرا رہی ہے تو آپ کو دلی تکلیف ہوئی، اور آپ ﷺ کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش! کوئی ایسی تقریب ہاتھ لگ جاتی جس سے میرے اور میری قوم کی دوری ختم ہوجاتی۔ آپ ﷺ کو یہ خواہش اس لیے پیدا ہوئی کہ آپ ﷺ ان کے ایمان کے حریص تھے۔

ایک دن کی بات ہے آپ ﷺ قریش کی مجلس میں تشریف فرما تھے کہ سورۂ نجم نازل ہونا شروع ہوگئی۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو پڑھ کر سنایا۔ جب آپ ﷺ سناتے سناتے ﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى﴾ (بھلا تم نے لات اور عزی اور ایک تیسرے مناۃ کے حال پر غور کیا؟) تک پہنچے، تو شیطان نے آپ ﷺ کی زبان پر وہ چیز جاری کردی جس کی آپ کو تمنا تھی، یعنی ''تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى، إِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْجٰى'' (یہ بلند مقام دیویاں ہیں، اور یقیناً ان کی شفاعت کی امید ہے) جب قریش نے یہ جملہ سنا تو خوش ہوگئے۔ آپ ﷺ آگے تلاوت کرنے لگے۔ جب پوری سورت تلاوت فرما کر آخر سورت میں آیت سجدہ پر پہنچے تو آپ ﷺ نے سجدہ فرمایا۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر تمام مسلمان اور مسجد میں موجود تمام مشرکین نے سجدہ کیا۔ مسجد میں کوئی ایسا مؤمن یا کافر نہ تھا جس نے سجدہ نہ کیا ہو سوائے ولید بن مغیرہ اور ابواُحیحہ سعید بن العاص کے۔ ان دونوں

نے ایک مٹھی مٹی لے کر اپنی پیشانی کی طرف بڑھائی اور اسی پر سجدہ کیا؛ کیوں کہ یہ دونوں بہت بوڑھے تھے، سجدہ نہیں کر سکتے تھے۔

مجلس ختم ہوئی، قریش چلے گئے؛ لیکن آج وہ بہت خوش تھے؛ کیوں کہ انھوں نے آج آپ ﷺ کو اپنے معبودوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا تھا۔ وہ لوگ کہنے لگے: ''محمد نے آج ہمارے معبودوں کو بڑا اچھا تذکرہ کیا ہے''۔ قریش نے یہ بھی کہا: ''یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ اللہ ہی زندگی دیتا ہے، وہی موت دیتا ہے، وہی پیدا کرتا ہے، وہی روزی دیتا ہے؛ لیکن اب تو ہمارے معبود بھی اس کے پاس ہماری سفارش کریں گے''۔ جب محمد نے ہمارے معبودوں کا بھی حصہ لگا دیا ہے، تو اب ہمیں ان کے ساتھ ہو جانا چاہیے۔

شام ہوتے ہی حضرت جبرئیلؑ حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اے محمد ﷺ! آپ نے لوگوں کے سامنے وہ آیتیں تلاوت کیں جنھیں لے کر میں اللہ کی طرف سے نہیں آیا تھا''؟ اللہ کے رسول ﷺ کو بڑا غم لاحق ہوا اور آپ کو بڑا ڈر لگنے لگا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی تسلی کے لیے یہ آیت ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَّلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ﴾ نازل فرمائی، اور اللہ تعالیٰ تو آپ ﷺ پر بڑے مہربان تھے..... جب یہ آیت نازل ہوئی، تو قریش نے کہا: ''محمد کو اب اس بات پر پچھتاوا ہو رہا ہے جو انھوں نے خدا کے یہاں ہمارے معبودوں کے بلند مقام کے بارے میں کہی تھی، اب پھر وہ پھر گئے''۔ اللہ کے رسول ﷺ کی زبان پر شیطان نے جو دو جملے جاری کر دیے تھے یہ ہر مشرک کی زبان پر تھے، چنانچہ وہ لوگ پہلے سے زیادہ شرارت پر اتر آئے اور مسلمان کو پہلے سے زیادہ ستانے لگے''۔

(معالم التنزيل : ٥ / ٣٩٣، سورة الحج)

اس قصے کی حیثیت

یہ ہے وہ واقعہ جسے تفسیر کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے؛ لیکن اس کی حیثیت کیا ہے، اس کا اندازہ مفسرین ومحدثین کے ان اقوال لگایا جا سکتا ہے:

☆ **حافظ ابن خزیمہؒ (م:۳۱۱ھ) کہتے ہیں:**

"إنها من وضع الزنادقة" .

(التفسير الكبير للرازي : ١٢ / ٥٠)

''یہ قصہ زندیقوں کا گھڑا ہوا ہے''۔

☆ **امام بیہقی (م:۴۵۸ھ) کہتے ہیں:**

"هذه القصة غير ثابتة من جهة النقل" .

(دلائل النبوة : ٢ / ٦٢)

''یہ قصہ نقلاً ثابت نہیں ہے''۔

☆ **قاضی ابوبکر ابن العربیؒ (م:۵۴۳ھ) کہتے ہیں:**

"إنها باطلة لا أصل لها" .

(أحكام القرآن لابن العربي المالكي: ٣ / ٣٠٧، سورة الحج)

''یہ قصہ باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں''۔

☆ **قاضی عیاضؒ (م:۵۴۴ھ) لکھتے ہیں:**

" يكفيك في توهين هذا الحديث أنه لم يخرجه أحد من أهل الصحة ، ولا رواه ثقة بسند سليم متصل ؛وإنما أُولِعَ به وبمثله المفسرون والمؤرخون المولَعون بكل غريب ، المتلقفون من الصحف كل صحيح وسقيم" . (الشفا بتعريف حقوق المصطفى للقاضي عياض : ٦٤٥)

''اس روایت کے کمزور ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ اسے ان محدثین میں سے کسی نے نقل نہیں کیا ہے جو نقل روایت میں صحت کا التزام کرتے ہیں، اور نہ ہی اسے کسی ثقہ روای نے ایسی سند متصل سے روایت کی ہے جو ہر طرح کی علت سے محفوظ ہو۔ اس طرح کی روایتوں کے نقل کرنے میں ایسے مؤرخین ومفسرین دل چسپی لیتے ہیں، جنھیں ہر نادر وانوکھی چیز کے نقل کرنے میں مزہ آتا ہے، اور جو کتابوں اور صحیفوں سے ہر رطب ویابس کو جمع کرنے کے دلدادہ ہوتے ہیں''۔

☆ **امام فخر الدین رازیؒ (م:۶۰۶ھ) لکھتے ہیں:**

"هذه القصة باطلة موضوعة، لايجوز القول بها ، قال الله تعالىٰ "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ" . (التفسير الكبير : ١٢/ ٥٠)

''یہ واقعہ سراسر باطل اور موضوع ہے۔ اس کا ذکر کرنا بھی

جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''آپ اپنی نفسانی خواہش سے نہیں بولتے۔ آپ کا ارشاد سراسر وحی ہے جو آپ ﷺ پر بھیجی جاتی ہے''۔

☆ **حافظ ابن کثیرؒ (م:۷۰۳ھ) لکھتے ہیں:**

"وقد ذكر كثير من المفسرين ههنا قصة الغرانيق ...... ولكنها من طرق كلها مرسلة ولم أرها مسندةً من وجه صحيح". (تفسير القرآن العظيم لابن كثير: ١٠/ ٨٣-٨٤)

''اس آیت کے ذیل میں بہت سے مفسرین نے قصۂ غرانیق کو نقل کیا ہے؛ لیکن یہ قصہ جتنے طرق سے آیا ہے، سب کا سب مرسل ہے، اور میری نظر میں کسی کی سند درست نہیں ہے''۔

☆ **امام شوکانی (م:۱۲۵۵ھ) اس پورے قصے کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:**

"ولم يصح شيء من هذا، ولا ثبت بوجه من الوجوه، ومع عدم صحته؛ بل بطلانه فقد دفعه المحققون بكتاب الله سبحانه". (فتح القدير: ٢/ ١٥٩، سورة الحج)

''ان روایات میں سے کچھ بھی صحیح نہیں ہے، اور کسی طرح یہ واقعہ ثابت نہیں ہے، اس کے عدم صحت بلکہ باطل ہونے کے ساتھ ساتھ محققین نے کتاب اللہ کی روشنی میں اسے رد بھی کر دیا ہے''۔

یہ روایت باطل کیوں ہے؟

یہ روایت اس لیے باطل ہے کہ یہ سنداً، متناً اور معناً کسی لحاظ سے قابل اعتبار نہیں۔

سندی لحاظ سے: سنداً اس لیے کہ یہ جتنے طرق سے مروی ہے سارے کا سارا مرسل ہے۔ (اور مرسل روایت کے بارے میں بنیادی طور پر محدثین کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ وہ قابل رد ہے؛ کیوں کہ جو راوی حذف ہے، اس کے حالات کا علم نہیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ صحابی نہ ہو اور ضعیف ہو۔) مزید برآں یہ کہ ان میں ضعف اور راوی کے مجہول ہونے کی علامت بھی پائی جاتی ہے سوائے چار طرق کے، اور وہ یہ ہیں:

۱۔ سعید بن جبیر کے واسطے سے۔
۲۔ ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث کے واسطے سے۔
۳۔ ابوالعالیہ کے واسطے سے۔
۴۔ قتادہ کے واسطے سے۔

یہ چاروں طرق ایسے ہیں جو گو مرسل ہیں؛ مگر ان میں ضعف اور جہالت نہیں ہے، پھر بھی ان سے استدلال نہیں کیا جا سکتا؛ کیوں کہ وہ حدیث مرسل جس کے ارسال کرنے والے کئی ہوں، اپنے اندر دو احتمالات رکھتی ہے:

۱۔ یا تو تمام ارسال کرنے والوں کا مصدر ایک ہو۔
۲۔ یا ہر ایک کا مصدر الگ الگ ہو؛ لیکن سب کے سب ضعیف ہوں۔

اب ان چاروں طرق میں بھی یہ احتمال ہے کہ سب کا مصدر ایک ہو۔ اور وہ ہے کون، پتہ نہیں۔ یا یہ کہ سبھوں نے جن سے روایت لی ہو، وہ الگ الگ ہوں اور وہ سب ضعیف ہوں -ان احتمالات کے رہتے ہوئے اس روایت کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟ خاص طور پر جب کہ اس سے عصمت انبیا پر مخدوش ہوتی ہو۔

جہاں تک تعلق ہے حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا، تو اس کے سارے طرق انتہائی کمزور اور حد درجہ ضعیف ہیں، لہٰذا وہ بھی نا قابل استدلال ہیں۔

یہ روایت تین طرق سے مروی ہے۔ پہلی طرق میں کلبی ہے جو کذاب ہے۔ دوسرے میں ابن عباسؓ سے پہلے راوی کا نام ہی نہیں ہے، جب کہ تیسرے طرق میں ابوبکر الہذلی ہیں جس کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے: "أخباريٌّ متروك الحديث". [تقريب التهذيب: ٦٢٥، تحقيق: محمد عوامة]

''یہ مؤرخ ہیں اور حدیث میں متروک ہیں''۔

خود حافظ ابن حجرؒ نے ان تینوں طرق بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

"وكلها سوى طريق سعيد بن جبير إما ضعيف وإما منقطع". (فتح الباري: ٨/ ٣٠٢)

''سعید بن جبیر کے طرق کو چھوڑ کر یہ سارے طرق یا تو ضعیف ہیں یا منقطع''۔

یہ تو سندی لحاظ سے بطلان کی وجہ تھی۔

متن کے لحاظ سے: اگر اس روایت کے متن کو دیکھا جائے تو خود واضح ہو جائے گا کہ یہ نا قابل اعتبار ہے؛ کیوں کہ اس میں بڑا اختلاف و اضطراب پایا جاتا ہے، ساتھ ہی اس میں نکارت بھی پائی جاتی ہے جو ذات رسالت مآب ﷺ سے بالکل میل نہیں کھاتی۔

۱۔ پہلی بات تو یہ کہ ساری روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ شیطان نے اللہ کے رسولؐ کی زبان پر "تلك الغرانيق العلى، وإن شفا عتهن لترجى" جیسے شرکیہ کلمات جاری کروادیے جن سے مشرکین کے معبودوں کی تعریف نکلتی ہے، حالاں کہ بہ نص قرآن یہ ناممکن ہے۔

۲۔ بعض روایتوں (روایت کے لیے دیکھیے: نصب المجانیق: ۲۲) میں ہے کہ مؤمنوں کو اس کے وحی الٰہی ہونے میں کوئی شبہ پیدا نہ ہوا، جب کہ بعض طرق (روایت کے لیے دیکھیے: نصب المجانیق:۲۴) میں اس کی وضاحت ہے کہ مسلمانوں نے اس چیز کو سنا جو شیطان نے القا کیا تھا۔ اب یہ دونوں روایتیں آپس میں مختلف ہیں۔

۳۔ بعض طرق (دیکھیے: نصب المجانیق:۲۱) کے اندر یہ آیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے یہ خواہش کی کہ آپ پر کوئی ایسی وحی نازل نہ ہو جس سے مشرکین کے معبودان کی مذمت ہوتی ہو؛ تاکہ وہ لوگ آپ سے دور نہ بھاگیں۔

۴۔ بعض طرق (دیکھیے: نصب المجانیق:۳۲) سے پتہ چلتا ہے کہ شیطان نے آپ کی زبان مبارک سے یہ شرکیہ کلمات اس وقت جاری کرائے جب آپ نماز پڑھا رہے تھے۔

۵۔ بعض طرق (دیکھیے: نصب المجانیق:۱۰) سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو ایک مدت تک پتہ ہی نہیں چلا کہ یہ عمل شیطانی ہے، جب جبرئیل علیہ السلام نے آکر بتلایا کہ میں آپ کے پاس یہ کلمات لے کر نہیں آیا تھا؛ بلکہ شیطان کی طرف سے ہے، تو آپ کو معلوم ہوا۔

اب غور کیجیے کہ جس روایت کے متن میں اس قدر اختلاف ہو، اور جس میں شرکیہ کلمات کا اللہ کے رسول ﷺ کی زبان پر جاری ہونے کا ذکر ہو، کیا وہ کسی اعتبار کے لائق ہے؟!

معنوی لحاظ سے: اگر معنوی لحاظ سے دیکھا جائے تب بھی یہ روایت باطل ہے؛ کیوں کہ بقول **شیخ عبدالغنی عبدالخالق مصریؒ:**

"تمام انبیا سے متعلق یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی ایسے شخص کو نبی نہیں بنایا جس نے ایک لمحے کے لیے بھی شرک کیا ہو"، جب کہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے (نعوذ باللہ) یہ شرکیہ کلمات کہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان پر شیطان کا تسلط نہیں ہوسکتا، تو پھر انبیا اور پھر انبیا کے سردار کے بارے میں یہ تصور کیسے کیا جا سکتا ہے کہ شیطان نے آپ کی زبان پر یہ کلمات جاری کروادیے! پھر عصمت انبیا کا مطلب کیا ہوگا؟ کیا کوئی نبی معبودان باطل کی تعریف کرسکتا ہے، جب کہ یہ کفر ہے؟۔ (حجیت سنت:۱۳۴)

قاضی ابوبکر ابن العربیؒ لکھتے ہیں:

"اس پر امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو کفر و شرک سے محفوظ رکھا ہے۔ جو کہے کہ آپ سے کفر کا صدور ہوسکتا ہے، یا اللہ کے بارے میں آپ ﷺ شک میں مبتلا ہو سکتے ہیں، تو سمجھ لو کہ اس نے اپنی گردن سے اسلام کا پٹہ اتار کر پھینک دیا ہے۔ آپ تو افعال کے اندر بھی معصیت نہیں کر سکتے، چہ جائے کہ اعتقاد کے بارے میں آپ ﷺ کی طرف کفر منسوب کیا جائے"۔ (أحكام القرآن لابن العربي: ۳/ ۳۰٤، سورة الحج)

علامہ مبارکپوریؒ نے تحفۃ الاحوذی میں قاضی عیاضؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

"مشرکوں کے سجدہ کرنے کی جو وجہ مؤرخین و مفسرین نے لکھی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے معبودوں کی سورۃ النجم میں تعریف کر دی تھی، یہ بالکل باطل ہے۔ یہ عقلاً اور نقلاً کسی لحاظ سے درست نہیں ہے؛ کیوں کہ غیر اللہ کی تعریف کرنا کفر ہے۔ اس کی نسبت اللہ کے رسول ﷺ کی طرف کرنا درست نہیں ہے۔ نہ یہ کہنا جائز ہے کہ شیطان نے آپ ﷺ کی زبان سے یہ شرکیہ کلمات جاری کرادیے تھے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ شیطان کو آپ ﷺ پر قابو حاصل ہو جائے"۔ (تحفة الأحوذي: ۳/ ۱٦۷)

اس روایت کے سلسلے میں حافظ ابن حجر کا نقطۂ نظر

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ یہ روایت بالکل باطل ہے؛ لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کے تمام طرق پر ضعف اور انقطاع (سعید بن جبیر کے طرق کو چھوڑ کر) کا حکم لگانے کے بعد لکھا ہے: "لكن كثرة الطرق تدل على أن للقصة أصلاً . وقال : فإن الطرق إذا كثرت وتباينت مخارجها دل ذلك على أن لها أصلاً". (فتح الباری :۸/ ۳۰۲-۳۰۳، رقم الحدیث : ٤٧٤٠)

''کثرت طرق اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس واقعہ کی کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ مزید فرمایا: جب کوئی روایت مختلف طرق سے آئے، تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہے''۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حافظ ابن حجرؒ بھی جمہور امت کی طرح یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کی ذات معصوم ہے جیسا کہ علامہ آلوسی نے لکھا ہے:

"وعلى كل حال، فإن الحافظ ابن حجر رحمه الله متفق مع الذين أنكرو القصة على تنزيهه ﷺ من أن يكون للشيطان تكلم على لسانه عليه الصلاة والسلام ، فالخلاف بينه وبينهم يكاد يكون شكلياً أو لفظياً ". (نصب المجانيق:٦٦)

''خلاصہ یہ کہ حافظ ابن حجر بھی (ان ہی لوگوں کی طرح جو اس قصے کا انکار کرتے ہیں) اس بات پر متفق ہیں کہ آپ ﷺ اس بات سے منزہ ہیں کہ شیطان آپ کی زبان پر اس طرح کے کلمات جاری کرادے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے، تو جمہور سے ان کا اختلاف صرف اور صرف لفظی اور شکلی ہے''۔

دوسری بات یہ کہ ابن حجر کی گفتگو یہاں اسی انداز کی ہے جس طرح معاشرے کے اندر کوئی چیز عام ہو جائے، تو لوگ دو حصوں میں بٹ جاتے ہیں: کچھ مانتے ہیں کچھ انکار کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جب بات اتنی پھیل چکی ہے تو لگتا ہے کہ کچھ نہ کچھ اس کی اصلیت ضرور ہے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا وہ اس بات کو مکمل مانتے ہیں۔

حافظ ابن حجر کا بھی یہی کہنا ہے کہ چوں کہ یہ قصہ مختلف طرق سے آیا ہے اسی لیے اس کی کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہوگی، چنانچہ بخاری وغیرہ کے اندر روایت تو آئی ہے؛ لیکن اسمیں ''بتوں کی شفاعت والے الفاظ'' نہیں ہیں۔ بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

"سجد النبي ﷺ بالنجم وسجد معه المسلمون والمشركون، والجن والإنس ". (صحيح البخاري، كتاب سجود القرآن باب سجود المسلمين مع المشركين، رقم :١٠٧١)

''سورۃ النجم (کے اخیر) میں اللہ کے نبی ﷺ نے سجدہ کیا، اور آپ ﷺ کے ساتھ مسلمان، مشرکین اور جنات وانسان نے بھی سجدہ کیا''۔

اس لحاظ سے تو اصل کہا جا سکتا ہے؛ لیکن بہر حال چوں کہ اس کا تعلق ''قصۂ غرانیق'' سے کچھ بھی نہیں ہے، اس لیے دل کو لگتی بات وہی ہے جو مشہور محقق علامہ احمد محمد شاکرؒ نے لکھا ہے: "وقد أخطأ في ذلك خطأً لانرضاه له ، ولكل عالم زلة ، عفا الله عنه". (سنن الترمذی:٢/ ٤٦٥،تعليق:أحمد شاكر)

''علامہ سے اس سلسلے میں چوک ہوئی ہے جسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہر عالم سے چوک ہو سکتی ہے۔ اللہ انھیں معاف فرمائے''۔

خلاصۂ کلام

قصۂ زیر بحث پر مختلف پہلوؤں سے غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ یہ قصہ عقلاً اور نقلاً ہر لحاظ سے باطل ہے؛ کیوں کہ یہ نہ صرف عصمت نبی اور قرآنی نصوص سے متصادم ہے؛ بلکہ قرآن کریم کے سلسلے میں تشکیک کا دروازہ کھولنے والا بھی ہے۔

(نوٹ) اس مضمون کی تیاری میں علامہ البانیؒ کی کتاب نصب المجانيق لنسف قصة الغرانيق سے خصوصی استفادہ کیا گیا ہے۔)

☆☆☆

□ فکر و نظر

تدبرِ کائنات، اسلامی ایمانیات اور قرآنِ مجید کا طریقِ استنباط

مولانا محمد عبداللہ شارق

ایک ضروری تمہید

یہ کائنات اسلامی ایمانیات کی ایک نہایت محکم و مکمل دلیل ہے اور اسلامی دعوت و پیغام کی صداقت وحقانیت کے ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کرتی ہے، نیز جب کسی فرد پر کائنات کی یہ گواہی منکشف ہوتی ہے تو کائنات کا ہر ایک ذرہ اور ہر ایک رنگ اس کے لیے ایمان کی تقویت کا زبردست ذریعہ بنتا ہے، ہمارا مقصود اپنی اس تحریر میں اسی موضوع کے حوالہ سے کچھ معروضات پیش کرنا ہے۔ تاہم اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ کہ کائنات کی اس شہادت کو پورا پورا سمجھنے کی توفیق انسان کو عموما انبیاء کی دعوت سننے اور تدبرِ کائنات کا صحیح منہج انہی سے سیکھ لینے کے بعد ملتی ہے۔ نبی کے لب ہلتے ہیں اور کائنات سے استنباط کا منہجِ صحیح وہ بیان کرتا ہے تو یکا یک ایک جہان انسان کے سامنے روشن ہوجاتا ہے اور کائنات کے جلووں میں چمکتا ہوا اللہ کا نور انسان کے ظاہر و باطن کو خیرہ کر دیتا ہے، جبکہ نبوی دعوت کو سنے بغیر اگر کائنات میں تدبر کیا جائے تو بہت دفعہ انسان ایک اچھا طبیب یا سائنس دان تو بن جاتا ہے، مگر کائنات کے ان مقناطیسی انوارات تک مکمل رسائی پانے سے محروم رہتا ہے جو انسان کو اس کے رب سے ہم کنار کرتے ہیں، اس کی عظمت وجلال کا نقش دل میں بٹھاتے ہیں اور اس کی بارگاہ میں حاضری کا احساس دل میں پیدا کرتے، نیز پیغمبرانِ خدا کے دامنِ فیض سے وابستہ کرتے ہیں۔

تاہم یہ بھی ہوسکتا ہیکہ کسی بادیہ نشین کو اللہ پاک کسی رسول کی دعوت سنے بغیر ہی اس کی صدقِ طلب اور صفاءِ باطن کی بناء پر براہِ راست کائنات میں تدبر کرنے سے ان ایمانیات تک رسائی عطا فرمادیں جن کی دعوت دے کر اللہ پاک انبیاء کو مبعوث فرماتے ہیں۔ ایسا ممکن ہے اور بلاشبہ ممکن ہے، مگر یہ عمومی ضابطہ نہیں۔ عام طور پر انسانوں کو کائنات کی شہادت کا ادراک پیغمبر کے لب ہلنے اور اس کی دعوت سننے کے بعد ہی ہوتا ہے، چنانچہ اللہ رب العزت نے اسی وجہ سے قرآن کریم میں جہاں جابجا کائناتی نشانیوں کی طرف متوجہ کیا ہے، وہیں ایک سے زیادہ مقامات پر یہ ارشاد بھی فرمایا ہے کہ رسول بھیجے بغیر کسی قوم کو پکڑنا ہمارا طریقہ نہیں۔ مثلا ایک جگہ ارشاد ہے:

"وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَى حَتّٰى يَبْعَثَ فِى أُمِّهَا رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا" (القصص:59)

یعنی ''تمہارا رب بستیوں کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ ان کے مرکزی مقام میں کوئی رسول مبعوث نہیں فرما لیتا جو ان کو ہماری آیات اور نشانیاں پڑھ کر سنائے۔''

''مرکزی مقام'' کا ذکر اس لیے فرمایا کیونکہ یہاں سے نبی کا پیغام بآسانی اطراف واکناف تک پہنچ جاتا ہے اور طلب گاروں کے لیے نبی تک پہنچنا آسان ہوتا ہے، اس ارشاد سے یہ

بھی معلوم ہوا کہ اگر چہ نبی پہل کرتے ہوئے خود ہی چل کر بے طلبوں کے پاس جاتا ہے اور اس انتظار میں نہیں رہتا کہ کوئی ضرورت مند خود چل کر آئے گا تو اس کو پیغام سنادوں گا، مگر خود نبی کا ایک ایک آدمی کے دروازے پر چل کر آنا بہر حال ضروری نہیں، بلکہ نبی کا کسی مرکزی مقام میں مبعوث ہوجانا اور اطراف واکناف تک اس کے پیغام کا پہنچ جانا خود ان اطراف کے لوگوں کو بھی ذمہ دار بناتا ہے کہ وہ خود آگے بڑھ کر مزید خبر گیری کریں اور خدا کے اس منادی کے حوالہ سے صحیح معلومات حاصل کریں۔

خیر، یہاں پر عرض صرف یہ کرنا مقصود ہے کہ کائنات ایک محکم ومکمل دلیل ہے دینِ الٰہی کے مبنی برحق ہونے کی، مگر انسان کے حواس اور دل ودماغ پر پڑے غفلت کے دبیز پردے عموماً اس کو نہ تو کائنات میں کسی اعلیٰ مقصد کے لیے تدبر کرنے دیتے ہیں اور نہ ہی استنباط کر کے صحیح نتائج تک پہنچنے دیتے ہیں، عام طور یہ حجابات انبیاء کے دعوت وپیغام کو سننے کے بعد ہی دور ہوتے ہیں اور انبیاء ہی کے طریقہء استنباط کو سن کر انسان کو یہ توفیق ہوتی ہے کہ وہ اس کائنات کو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے دیکھے اور ایک عظیم الشان طریقہء استنباط کے ساتھ اس سے صحیح نتائج اخذ کرے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انسان کی راہ نمائی کے لیے صرف کائنات نہیں بنائی، بلکہ اس بات کا اعلان بھی کیا کہ پیغمبر بھیجے بغیر گرفت کرنا ہمارا طریقہ نہیں اور بتایا کہ ہر قوم میں ایک سمجھانے والا گذر چکا ہے۔(فاطر:24)

ہم نے یہاں پر کائنات کی شہادتوں کے حوالہ سے اپنے طور پر کچھ کہنے کی بجائے، آخری آسمانی صحیفہ ''قرآن'' ہی کے اسلوبِ دلیل وطریقہء استنباط کے حوالہ سے کچھ توضیحات عرض کرنے پر اکتفاء کیا ہے کہ قرآن اور اس کی اتباع میں صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی ایمانیات کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے کس طرح کائناتی حوالوں کا مسلسل ذکر کرتے ہیں اور کس طرح کائنات کے یہ حوالہ جات بنجر دلوں کو سرسبزی وشادابی عطا کرتے ہیں، اس سے قاری کے سامنے انبیاء کی پیش کردہ مشترکہ اسلامی دعوت کا خلاصہ بھی آجائے گا اور کائنات سے صحیح نتائج اخذ کرنے کا وہ طریقہء استنباط بھی جو عموماً انبیاءِ کرام اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کرتے ہیں، آیئے دیکھتے ہیں۔

تدبرِ کائنات کی فیصلہ کن اہمیت

دلیل دینے کے معاملہ میں قرآنِ کریم کا ایک نہایت اہم، توجہ طلب اور تقریباً ہر سورہ میں مکرر سہ کرر ذکر ہونے والا اسلوب یہ ہے کہ یہ طالبِ ہدایت کو بار بار تدبرِ کائنات کی اور کائناتی نقشہ کو جستجوئے حق کے جذبہ سے دیکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ ایک آزمودہ حقیقت اور خدا کے لاکھوں کروڑوں صالح بندوں کا عملی تجربہ ہے کہ اسلامی ایمانیات کا جو پر کیف اور قطعیت سے بھرپور تجربہ انسان کو کائناتی نقشہ بچشمِ خود دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے اور خصوصاً خالق کے اسلامی تعارف کا جو بدیہی یا نیم بدیہی تیقن انسان کو اس راہ سے حاصل ہوتا ہے، وہ محض کتابیں پڑھنے اور لفظی دلائل کے سن لینے سے ممکن نہیں۔ جدید انسان کا المیہ یہ ہے کہ یہ بند کمروں میں بیٹھ کر فکری بوکاٹے لڑانے سے ہی سب کچھ حاصل کر لینا چاہتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے خود ساختہ مصنوعی تفکرات نے اس سے بصیرت کی وہ روشنی سلب کر لی ہے جو زمین وآسمان کے ہوش ربا آثار وتغیرات کو بہ چشمِ خود دیکھنے سے انسان کو حاصل ہوتی ہے۔

جو آدمی قرآن فہمی کا دعویٰ کرتا ہے اور قرآن کے مطالعہ کے ساتھ کائنات کے مطالعہ کو اس نے اپنی زندگی میں شامل نہیں کر رکھا تو اس کا دعوائے قرآن فہمی درست نہیں۔ جدید دور کے انسان کے ساتھ یہ بڑا ہی دردناک المیہ پیش آیا ہے کہ یہ کائناتی نظاروں کے عملی مشاہدہ سے محروم ہو چکا ہے اور انفس وآفاق میں موجود خدا کی عظیم نشانیوں کو بہ چشمِ تدبر دیکھنے کے لیے تیار نہیں، زیادہ سے زیادہ وہ اس سلسلہ میں تفریحی انداز کے اندر چند ایسی کتابیں پڑھ لینا یا ویڈیوز کو دیکھ لینا ہی کافی سمجھتا ہے جن کے اندر بعض مناظرِ کائنات کی نقشہ کشی کی گئی ہوتی ہے یا پھر جو لوگ عملاً دیکھتے بھی ہیں تو وہ جتنا اس کائنات کو مادی اغراض ومقاصد کے لیے دیکھنے میں ترقی یافتہ ہیں اور تدبرِ کائنات کے نام پر جتنی ہوش ربا ترقی انہوں نے اس حوالہ سے کی ہے، موٹے حروف میں لکھے ہوئے اور روحِ کائنات کی نشان دہی کرنے والے کائناتی اوراق کو پڑھنے میں وہ اتنے ہی بدو اور نااہل واقع ہوئے ہیں۔

قرآنی مطالبہ ''تدبرِ کائنات'' کا لازمی تقاضا ایک تو یہ ہے کہ آدمی اس کائنات کو عملاً کھلی آنکھ کے ساتھ بہ چشمِ خود دیکھے، دوسرا یہ کہ طالبِ حق بن کر یہ سب کچھ بہ چشمِ تدبر دیکھے۔ کائناتی مناظر کی نقشہ کشی کو صرف پڑھنا یا ویڈیوز میں دیکھنا، انہیں عملاً کھلی آنکھ کے ساتھ بہ چشمِ تدبر طالبِ حق بن کر دیکھنے کا قائم مقام کبھی نہیں ہوسکتا، ان دونوں کے اثرات میں زمین وآسمان کا فرق ہے اور قرآن کا مطالبہ اپنے قاری سے بنفسِ نفیس تدبر کرنے کا ہے، نہ کہ کتابوں میں کائناتی معلومات پڑھنے کا اور سچ کہوں تو نرا کتابی انہماک سرے سے انسان کی اس حس کو ہی مار دیتا ہے جو کائنات کے جلووں میں کوئی ولولہ محسوس کرتی ہے۔ بالفاظِ اقبال ؎

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا کہ
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

جدید انسان نے الحاد کے من پسند رنگ کی ایک عینک چڑھا کر، لیبارٹریوں میں جاکے اس کائنات کو صرف اپنے مادی مفادات اور مادی اغراض کے لیے ہی دیکھا ہے، جبکہ غیر جانب دارانہ نگاہ سے اس کائنات کو دیکھنے اور اس میں موجود موٹے حروف سے لکھے ہوئے معرفتِ الٰہی کے اوراق کا سامنا کرکے انہیں اپنے من میں اتارنے میں یہ اتنا ہی پست اور پس ماندہ واقع ہوا ہے۔ سو ظاہر ہے کہ جب ہم لوگ اسلامی مبادیات کی فکری پختگی کو ملاحظہ کرنے کے لیے اس کائنات کو بچشمِ خود اس زاویہ سے دیکھیں گے نہیں جس زاویہ سے رب العلمین اس کائنات کو دیکھنے کی بنی نوع انسان کو تلقین کرتا ہے تو آپ ہی بتائیے کہ ہم کائنات کی گواہی کو محسوس کیسے کریں گے اور عملاً تدبرِ کائنات کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے ایقان وعرفان کی برکات کیسے حاصل کرسکیں گے، ورنہ جو لوگ اس کائنات کو بچشمِ خود اس زاویہ سے دیکھتے ہیں تو وہ اس گواہی کو محسوس بھی کرتے ہیں اور اثباتِ مدعا کے لیے کافی وافی بھی سمجھتے ہیں۔

تدبرِ کائنات اور جملہ اسلامی ایمانیات

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کائنات زیادہ سے زیادہ صرف وجودِ باری تعالی کی دلیل ہے، مگر یہ درست نہیں۔ قرآن کریم میں نہ صرف وجودِ باری تعالی یا توحید، بلکہ رسالت اور آخرت جیسے امور کے احقاق کے لیے بھی انسان کو کائناتی نظام کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور کائنات ہی کے ایک حوالہ کو جملہ ایمانی بنیادوں کے اثبات کے لیے کام میں لایا گیا ہے۔ قرآنیات کے ایک محقق عالم امام جصاصؒ نے لکھا ہے کہ قرآن جب یہ کہتا ہے کہ کائنات میں انسان کی نصیحت اور سبق آموزی کے لیے آیات (بصیغہ جمع) ہیں تو اس کا معنی ہوتا ہے کہ کائنات میں انسان کے لیے صرف ایک ہی قسم کی ایمانی راہ نمائی نہیں، بلکہ کئی طرح کی ایمانی راہ نمائیاں موجود ہیں۔ (احکام القرآن، ابوبکر الجصاص، جلد 2، صفحہ 66۔ ط: قدیمی کتب خانہ، کراچی) اس امر کی وضاحت کے لیے ہم چند اشارات یہاں عرض کرتے ہیں جس سے ان شاء اللہ بخوبی معلوم ہوجائے گا کہ قرآن کے استدلالات اس حوالہ سے کتنے نکتہ رس اور مبہوت کن ہیں۔

خدا کا اسلامی تعارف اور تدبرِ کائنات

قرآن کا مطالبہ خدا کو صرف موجود مان لینے کا نہیں، بلکہ دل ودماغ پر اس خدا کی ہیبت طاری کرنے، حقائق کے مطابق اپنے رویے اس رب کے حوالہ سے درست کرنے اور تعظیم ومحبت کا تعلق اس سے قائم کرنے کا بھی ہے اور اسی کا نام ''ایمان باللہ'' ہے۔ نیز جس طرح یہ کائنات وجودِ باری تعالی کا اثبات ہمارے سامنے کرتی ہے، ویسے ہی اس رب سے تعظیم وتوقیر کا تعلق قائم کرنے کی تلقین بھی ہمیں کرتی ہے۔ چنانچہ قرآن عام طور پر نہ صرف خدا کے وجود کو ماننے کے لیے، بلکہ اس کی عزت وتوقیر کی لامتناہی حدوں کو سمجھنے کے لیے بھی کائنات میں تدبر کرتے رہنے کی برابر تلقین کرتا ہے۔ وہ سب آیات جن میں کائناتی ڈیزائن کی طرف اشارہ کرکے خدا کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، وہ صرف وجودِ باری تعالی کا ہی اثبات نہیں کرتیں، بلکہ خدا کے اسلامی تعارف کا اثبات بھی کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ وہ کن کن صفات کا حامل ہے، کیونکر تعظیم وتوقیر کے لائق ہے، اس کے ساتھ کیسا معاملہ رکھنا ہمارے لیے ضروری ہے، اس کے بارہ میں کون سے رویے خطرناک ہیں اور یہ کہ وہ کوئی مشینی خدا نہیں، بلکہ ایک زندہ وجاوید، متصرف خود مختار اور علیم وخبیر رب ہے۔

توحید اور تدبرِ کائنات

نیز توحیدی حرارت اپنے اندر پیدا کرنے کیلئے بھی قرآن میں انسان کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ کائنات کو دیکھے اور بتائے کہ کیا اس کائنات میں خدا کے سوا کسی اور کا کوئی تصرف نظر آتا ہے؟ کیا کوئی ہے جس نے خدا کی دی ہوئی قوتِ تسخیر اور خدا کے تخلیق کردہ میٹیریل کے بغیر کوئی ایک مکھی ہی اپنی طرف سپنائی ہو؟ جب ظاہر ہے کہ نہیں اور مشرکین بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات میں حقیقی، بالذات اور اولین تصرف صرف ایک ہی ذات کا ہے اور اگر کوئی دوسرا صاحبِ تصرف ہے بھی تو وہ خود اپنے وجود و بقاء میں اس حقیقی متصرف کا محتاج ہے، جب ایسا ہے تو پھر کسی کو اس عظیم و جلیل رب کے برابر لا بٹھانے، حاجتوں کے لیے اس کو پکارنے، اس کے سامنے تعظیم و ادب کی انتہاء پر چلے جانے، اپنی مشکل برآری کا مالک و مختار سمجھنے اور جو اپنے وجود و بقاء میں ہر آن کسی اور کا محتاج اور اپنی اصل میں بالکل صفر کی طرح ہے، اسے اس حی و قیوم کی صف میں لا کھڑا کرنے کی آخر کیا تُک ہے جو اس کائنات کا اول و آخر اور ظاہر و باطن ہے؟ ایک چھوٹے کو ایک بڑے کے برابر لا کھڑا کر کے اور اس پہ اصرار کر کے کیا ہم اس بڑے کی اہانت کے مرتکب نہیں ہوتے؟ اگر انسانوں کے مابین معاملہ کرتے ہوئے ہم حفظِ مراتب کے اس اصول سے کام لیتے ہیں جبکہ نفسِ انسانیت میں وہ سب برابر ہوتے ہیں تو ایک خدا اور اس کی مخلوق کو برابر لا کھڑا کرتے ہوئے ہمیں یہ اصول اور بڑے کی تعظیم و تکریم کا خیال کیوں عجیب لگتا ہے جبکہ ان دونوں میں درجہ اور رتبہ کے اعتبار سے کوئی چیز بھی مشترک نہیں اور نہ ہی آپس میں کوئی تقابل بنتا ہے؟

ایمان بالآخرۃ اور تدبرِ کائنات

اس کے بعد آیئے عقیدہ آخرت کی طرف۔ اس حوالہ سے قرآنِ کریم میں ہمیں کئی طرح کے استدلالات ملتے ہیں۔

استدلال نمبرا

انسان اس عظیم الشان اور ناقابل یقین وسعتوں کی حامل کائنات کو دیکھنے اور اس کے خالق کی عظمت کا نقش دل میں محسوس کرنے کے بعد جب اس دنیا میں انسانوں کے دو طرفہ رنگ اور ان کی دو طرفہ دوڑ دیکھتا ہے کہ ایک طرف رب کے وفا شعار، اس کے آگے رکوع و سجود کرنے والے، اس کی نعمتوں کا شکر کرنے، اس کی آزمائشوں پر صبر کرنے، اس کی مخلوق کے کام آنے والے اور رب کے ساتھ اپنے رشتہ کے مقابلہ میں ہر رشتہ کو چھوٹا سمجھنے والے اور رب کے نام پر جان دینے کا شوق رکھنے والے ہیں جو اس راہ پر پوری قوت سے دوڑے چلے جا رہے ہیں، جبکہ دوسری طرف اسی رب کے کچھ باغی، اس کے خلاف زبان درازی کرنے والے، نعمتوں کو ڈکار کر ان کا انکار کرنے والے، ذرا سا سرد و گرم آنے پر ناشکریوں کے پل باندھنے والے، آزمائش کے پہلو کا مذاق اڑانے والے، غفلت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر اسی کے ساتھ مرنے جینے کی قسمیں کھانے والے، راشی افسروں کی خوشامد کو تہذیب اور خداوندِ کریم کے روبرو رکوع و سجود کو خلافِ تہذیب سمجھنے والے اور کائناتی نظام کو اندھا نظام کہہ کر اس عظیم الشان کائنات کا مذاق اڑانے والے ہیں جو دوسروں کو بھی خدا پرستی کی راہ سے روکنے کے لیے جتن کر رہے ہیں اور اس راہِ بغاوت پر سرپٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

جب ایک سوچنے سمجھنے والا انسان انسانوں کی یہ دو طرفہ دوڑ اور یہ سب کچھ ہوتا ہوا دیکھتا ہے تو اس کا حساس اور بیدار دل کبھی اس بات پر یقین نہیں کرتا ہے کہ جو اس کائنات کا پرجلال، ذی وقار، سمیع و بصیر، علیم و خبیر اور علی شیء قدیر رب ہے، وہ ان دونوں فریقوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے گا، اس کے ہاں سیاہ و سفید کی کوئی تمیز نہ ہوگی اور اس نے یہ جہان اور اس جہاں کے دولہا میاں انسان کو بس یوں ہی فنا کے گھاٹ اتارنے کے لیے دنیا کا خلیفہ بنایا ہوگا، اس کے لیے نعمتوں اور رحمتوں کا سمندر بس یوں ہی بہا دیا ہوگا، سرد و گرم کا ایک سلسلہ بس یوں ہی چلا کر بھول گیا ہوگا، ضروری ہے کہ قیامت کا وہ دن واقع ہو کر ہمیں اس کی خبر اس کے سچے نبی دیتے ہیں، جب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا، یہ کائنات کے رب کی صفاتِ عظمت و جلال کا تقاضا ہے۔ کیا کوئی بھی عزتِ نفس رکھنے والا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو اس نے تخلیق و تدبیر کا ایک عظیم الشان نظام قائم کر رکھا ہو جو ہر دیکھنے

والے کی نگاہ کو اس خالق کے عظمت وجلال کے احساس سے آشنا کرتا ہو، جبکہ اس کے ہاں خود اپنے ہی باغیوں اور وفاداروں کا کوئی فرق نہ ہو، بس سب کو ایک ہی طرح کا صلہ دیا جاتا ہو کہ موت کے گھاٹ اتار کر قصہ مُکا دیا جاتا ہو؟ کیا کوئی عقل والا ہے جو اس بات سے اتفاق کرے؟

انسان کی حیثیت اس دنیا میں باقی جان داروں سے بہت مختلف ہے، یہ اس دنیا کا بادشاہ ہے، دنیا کی رونق اسی کیدم سے ہے، جس ٹھاٹھ اور باٹھ سے دنیا میں یہ رہتا ہے، کھاتا پیتا ہے، سوتا جاگتا ہے، سردی گرمی کے الگ الگ لباس زیبِ تن کرتا ہے، غیر معمولی گھر تیار کرتا ہے، صبح شام اپنے پیٹ کو بھرنے کے لیے پانی، پیاز، ٹماٹر، مرچ، نمک، گوشت، سبزی کے آمیزے آگ پہ چڑھاتا ہے، ضیافتوں میں شریک ہوکر خوش گپیاں کرتا ہے، شادیوں اور جنازوں کی تقریبات کرتا ہے، بازاروں کو آباد تا ہے، اپنے وجود کو تھکانے کی بجائے سواریوں پہ سوار ہوکر لمبے لمبے سفر کرتا ہے، علم وفن کے کمالات دکھاتا ہے، صنعت وحرفت کے جوہر آزماتا ہے، بحر وبر کے خزانوں پر کمندیں ڈالتا ہے، لوہے کو موم اور موم کو پتھر کرتا ہے، کیا کوئی اور مخلوق ہے جو اس شان کے ساتھ ہمیں اس دنیا میں نظر آتی ہو؟ انسان کا معاملہ باقی ذی روحوں سے بالکل الگ ہے اور دنیا میں اس کی شاہانہ حیثیت موجودہ سائنسی دور میں تو کچھ زیادہ ہی کھل کر نظر آرہی ہے، اس کو عقل صرف کھانے کے نت نئے ذائقے تیار کرنے کے لیے یا خلابازی کے کرتب دکھانے کے لیے ہی نہیں دی گئی، یہ عقل اپنے رب کے معاملہ میں بھی استعمال کرنی ہے، خدا نے اگر انسان کو اس کرہ ارض کا خلیفہ اور بادشاہ بنایا ہے تو ضرور اس کے پیچھے کوئی خاص مقصد بھی ہے، اگر شاکر وکافر کا کوئی فرق نہ ہو، صالح اور فاسق کا کوئی فرق نہ ہو، ظالم اور عادل کا کوئی فرق نہ ہو، ساجد اور باغی کا کوئی فرق نہ ہو، تعظیم وتمسخر میں کوئی فرق نہ ہو، رحم اور فساد میں کوئی فرق نہ ہو، بس سب نے ایک ہی طرح اس دنیا کا سرد وگرم سہہ کر پیوندِ خاک ہونا ہو تو اس انسان کی خلافتِ ارضی بے مقصد ٹھہرتی ہے اور ایسا تصور اختیار کرنا خود خدا سے بدگمانی اور بہت بڑی بدگمانی کے مترادف ہے۔ قرآن میں ہے:

"أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ. مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ" (القلم:35،36)

یعنی ''کیا ہم فرماں برداروں کو مجرموں کی طرح کردیں گے، تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ کیسی بہکی باتیں کہتے ہو؟''

استدلال نمبر۲

خدا کے ہاں اچھے برے کی تمیز کا یہ عالم ہے کہ وہ ہم انسانوں کے ضمیر اور خمیر میں رحم وعدل کی فطری تحسین اور ظلم وبے ہودگی کی فطری کراہیت پیدا کرکے ہمیں زمین پہ اتارتا ہے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس رب کے ہاں اچھے بری کی تمیز اتنی ضروری ہے اور وہ اس حوالہ سے ہمیں صاحبِ تمیز دیکھنا چاہتا ہے، کیا وہ کبھی نامہ سیاہوں اور روشن پیشانیوں کو ایک لاٹھی سے ہانک سکتا ہے اور یہ کہ ایسا سوچنا کیا اس رب کی بے توقیری اور بے تعظیمی کے مترادف نہیں ہے؟ اس استدلال کا اشارہ ہمیں قرآن میں سورہ القیامہ کی پہلی دو آیات کے اندر اور سورہ الشّمس کی آیات 7۔10 میں مل سکتا ہے، اگرچہ ان مقامات پر کہی گئی بات کا مقصود صرف اسی استدلال پر روشنی ڈالنا نہیں، بلکہ اور بھی بہت کچھ وہاں مضمر ہے۔

استدلال نمبر۳

نیز یہ جہان، اس میں انسان کی شاہانہ زندگی کا سامان، اس کی خدمت میں مصروف ایک ناقابلِ یقین اور عظیم الشان خواب ناک نظام اور خدا کے حوالہ سے سوچنے پر مجبور کردینے والے زمین وآسمان کسی بھی ذی شعور انسان کو یہ سوچنے پر حقیقتاً مجبور کردیتے ہیں کہ خدا نے یہ سب ہمیں اپنی ذات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے بنایا، وہ ان کائناتی نشانیوں کے ذریعہ ہمیں اپنی ذات کا تعارف کرانا چاہتا ہے، اپنی ذات وصفات کی وحدانیت پر دلائل قائم کرکے انسانوں کے رویوں کو آزمانا چاہتا ہے، اپنی عظمت وجلال کا نقش ہمارے دل میں بٹھانا چاہتا ہے، ہمیں اپنی بندگی کا پیکر بنانا چاہتا ہے اور اگر انسان کے کفر وشکر یا خدا کے معاملہ سے بالکل لاتعلق رہنے کے رویہ کا اس کی صحت پر کوئی اثر نہ

پڑنا ہوتا تو خدا سرے سے اس جہان کو ہی نہ بناتا، نہ انسان کو سوچنے سمجھنے والا دماغ دیتا، نہ اپنی یاد میں تسکین کا سامان رکھتا اور نہ ہی ہماری آنکھوں کے سامنے اپنی نشانیوں کا ایک ناپیدا کنار جہان کھڑا کرتا۔ ضرور خدا ہمیں اپنی ذات کے حوالہ سے بیدار، حساس اور محتاط دیکھنا چاہتا ہے اور اسی لیے اس نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ استدلال کی اس صنف کو ایک جگہ قرآن میں مومنوں کے دل کے احساس کی صورت میں بیان کیا گیا ہے:

"رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ" (آل عمران:191)

یعنی ''اے ہمارے رب! تو نے یہ سب بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے اس سے (بلکہ تو نے ضرور یہ سب ہمیں اپنا تعارف کرانے کے لیے بنایا ہے)۔''

نیز ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاء وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذَلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ۔ أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ۔ كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ" (ص:27-29)

یعنی ''ہم نے آسمان وزمین کو اور ان کے مابین کو بے مقصد پیدا نہیں کیا (بلکہ اس سے مقصود اپنی ذات کی توحید وتعارف پر دلائل قائم کرنا اور انسانوں کو اپنی عبادت ومعرفت کی طرف متوجہ کرنا ہے، سو جو شخص اب بھی ہماری راہ سے اعراض کرے گا اور کائنات کے عظیم الشان نظام کو بے مقصد ٹھہرائے گا تو اس پر ہمارا عذاب واجب ہوگا)، کائنات کو بے مقصد سمجھنا اور اس کی سبق آموزی سے انکار کرنا اہل کفر کا خیال اور گمان ہے اور ہماری نسبت ایسے گھٹیا خیالات رکھنے والے اہلِ کفر کے لیے ہلاکت خیز جہنم تیار ہے۔ کیا ہم ایمان اور اعمالِ صالحہ کی زندگی گذارنے والوں کو ان کی طرح کردیں گے جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں؟ یا کیا ہم بچ بچا کر احتیاط سے زندگی گذارنے والوں کو بددیانتوں کی طرح کردیں گے؟ (اے نبی!) یہ بابرکت کتاب ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کی ہے کہ لوگ اس کی آیات میں غور کریں اور اصحابِ عقل اس سے سبق حاصل کرسکیں۔''

اس طرح کی آیات جن میں کائنات کی مقصدیت اور انسان کی مقصدیت کی بات کہی گئی ہے، قرآن میں جابجا بکھری ہوئی ہیں، جن کا خلاصہ یہی ہے کہ ہم نے نہ تو کائنات کے عظیم الشان نظام کو پیدا کرکے انسان کے سامنے بے مقصد لا کھڑا کیا ہے اور نہ ہی ہم اپنے وفاداروں وباغیوں کو ایک لاٹھی سے ہانکیں گے، یہ کائنات ایک حق مقصد کے ساتھ پیدا کی گئی ہے اور وہ یہی ہے جس کی طرف کائنات اصحابِ تدبر کو چیخ چیخ کر متوجہ کرتی ہے، یعنی میرا ایک خالق ومالک ہے، وہ عظمت وجلال اور رحم وکرم کا پیکر ہے، سمیع وبصیر اور علیم وخبیر ہے، کائنات اس کے حکم میں بندھی ہوئی ہے، اس کو جانو اور مانو اور ویسے مانو جیسے ماننے کا حق ہے یا پھر اس کے حق میں کوتاہی کے مرتکب ہوکر ایک دہشت ناک انجام کے لیے تیار ہوجاؤ۔ اس مضمون کا اشارہ قرآن میں سورہ الانعام کی آیت 73 میں، سورہ یونس کی آیت 3، 4، 5 میں، سورہ زمر کی آیت 5-7 میں، سورہ انبیاء کی آیت 16-18 میں، سورہ حجر کی آیت 85، 86 میں، سورہ دخان کی آیت 38-42 میں، سورہ ص کی آیت 27-29 میں، سورہ آلِ عمران کی آیت 190، 191 میں، سورہ جاثیہ کی آیت 21، 22 میں، المومنون کی 115-118 میں اور سورہ قیامہ کی آیت 36-40 میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ کائنات کی مقصدیت کے اس ایک حوالہ سے غور وفکر کرنے کی سنجیدہ حس اگر انسان میں بیدار ہوجائے اور وہ اپنے اندر حق کی سچی طلب پیدا کرلے تو دنیا کی کوئی رکاوٹ اس کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکتی، وہ بتائیدِ الٰہی دینِ حق تک پہنچ کر ہی رہے گا، ان شاء اللہ۔

استدلال نمبر ۴

جو لوگ عقیدہ آخرت پہ گفت وشنید کرتے ہیں، ان کا ایک بڑا اشکال یہ ہوتا ہے کہ آخر موت کے بعد زندگی کیسے ممکن ہے؟ انہیں یہ بات ہضم نہیں ہوتی کہ جنت وجہنم کا جہان کیسے وجود میں

آئے گا؟ مرے ہوؤں میں پھر سے زندگی کا رشتہ کیسے جڑے گا؟ جو مر کے مٹی میں مل گئے، جن کی خاک کو ہوا نے اڑا کے کہیں سے کہیں بکھیر دیا، جن کی ہڈیاں بھی پیوندِ خاک ہوگئیں، ان کا جب تخم ہی ملنے کا نہیں تو ان میں نئی زندگی کا بلب کیسے روشن ہوگا؟ عرب کے مشرک اور جاہل بدو ہی نہیں، آج کے عقل پرست ملحد بھی عقیدہ آخرت پہ اس طرح کا اشکال کرتے ہوئے پائے گئیں اور ان کے بڑے بڑے ''ذہینوں'' کی سوئی بعض اوقات اسی سوال پہ اٹکی ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن نے بہت دفعہ عقیدہءِ آخرت کے اثبات کے لیے اور اس حوالہ سے لوگوں کے دماغ میں پیدا ہونے والے جالے کی صفائی کے لیے فقط قدرتِ خداوندی ہی کو بیان کرنے پر اکتفاء کیا ہے کہ دیکھو! اک نیا جہان کسی نھتو خیرے نے نہیں، اسی اللہ نے بنانا ہے جس نے یہ سارا نا پیدا کنار جہان سجایا ہے، پھر اس کی تخلیق پہ اعتراض کیسا اور اشکال کیسا؟

کیا جس نے یہ سارا جہان پیدا فرمایا، رنگ و بو کا فرش بچھایا، کسی کو اڑنا کسی کو پھدکنا سکھایا، آنکھوں کو چمکنا اور کانوں کو بجنے والا بنایا، کائنات کے نظاروں سے انسانی نگاہوں کو خیرہ فرمایا، کیا وہ یہ سب بنانے کے بعد اب خالی ہاتھ ہوگیا ہے، کیا نئے سرے سے ایک اور جہان کھڑا کر دینا اس کے لیے مشکل ہوگیا ہے؟ اگر کسی کو یہ رویہ علم و عقل کا نتیجہ لگتا ہے تو اس کے دماغی افلاس اور ذہنی دیوالیہ پن پر جتنا بھی افسوس کیا جائے، کم ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ نیا جہان بھی اسی نے بنانا ہے جس نے یہ جہان بنایا، پھر اشکال کس بات کا اور الجھن کس بات کی؟ ایک جگہ ارشاد ہے: "قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ" (یٰس:79) یعنی آخرت کا جہان اسی نے بنانا ہے جس نے یہ نظر آنے والا جہان بنایا۔ باقی کائنات صرف خدا کی قدرت کا نہیں، بلکہ آخرت کے فی الواقع اثبات کا بھی سامان اپنے اندر رکھتی ہے اور اس حوالہ سے چند اشارات ہم عرض کر چکے ہیں۔

ایمان بالرسالہ اور تدبرِ کائنات

اب آتے ہیں رسالت کی طرف، اللہ کی ذات کا یقین سارے ایمان کی جان اور بنیاد ہے اور یہ یقین جتنا کائنات کو دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے، اتنا کسی اور ذریعہ سے قطعاً ممکن نہیں ہے۔ کائنات کو دیکھنے سے نہ صرف اللہ کی ذات کا یقین حاصل ہوتا ہے، بلکہ اللہ کی صفات (حکیم، خبیر، قدیر، علیم، عظیم، جلیل، حلیم، حی وقیوم، رحمٰن ورحیم، جبار وقہار، سمیع وبصیر وغیرہ) کا علم بھی حاصل ہوتا ہے اور اللہ کی ذات کا رعب دل میں پیدا ہوتا ہے، پھر یہی رعب انسان کو اس رب کے حوالہ سے اپنے رویے درست کرنے اور غلط رویوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر اکساتا ہے، کائنات کے خالق و مالک اور رب کے حوالہ سے محتاط اور حساس بناتا ہے، اسی احتیاط اور حساسیت کے تحت جب کوئی آواز سنائی دے کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں تو وہ اس پر چونک اٹھتا ہے، صاحبِ آواز کی صدق وسچائی اگر غیر مشتبہ ہو تو وہی ربِ کائنات کا رعب اس کو اس صاحبِ آواز کا حلقہ بگوش بناتا ہے۔ اس کی نظر میں اس بات کے اندر کوئی عقلی استحالہ نہیں ہوتا کہ ربِ کائنات غیب کے پردوں کو چیرتے ہوئے اپنے کسی بندہ پر اپنا پیغام نازل کرے۔ یوں اس رب کی اپنی تمام تر صفات کے ساتھ موجودگی کا یقین، اس کی ہی ناراضگی کا خوف، اس کے عتاب سے بچنے کی لگن اور اس کے ''علی کل شیءٍ قدیرٌ'' ہونے کا احساس اسے انبیاء کے دامن سے وابستہ کرتا ہے، یہی طرزِ فکر پہلے بھی نیک بخت روحوں کو انبیاء کا حلقہ بگوش بنا کر رب العلمین کے رنگ میں رنگتا تھا اور یہی طرزِ فکر آج بھی انسان کو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے درِ فیض تک پہنچا کر اس میں ربانیت کی شان پیدا کر سکتا ہے۔

''ایمان بالرسالۃ'' اور تدبرِ کائنات کے باہمی تعلق کی یہ بات ہم یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ قرآن کا مطالبہ ہے کہ انسان ''تقوی'' اختیار کریں، ''تقوی'' کا لغوی معنی ہے: ''بچنا اور بچاؤ کرنا''، جبکہ اس کا مفہوم اور معنی مرادی ہے: ''اپنے اندر احتیاط اور حساسیت کا رویہ پیدا کرنا۔'' اب سوال یہ ہے کہ یہ تقوی، احتیاط اور حساسیت کا رویہ کس کے بارہ میں اختیار کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے تو جواب ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ اللہ کی ذات کے حوالہ سے ہے کہ رب العلمین کے حوالہ سے ہمارا معاملہ صرف عقلی اثبات کی حد تک محدود نہ ہو بلکہ اس حوالہ سے ہمارے اندر ایک گرمیءِ احساس بھی ہو، رب کی عظیم الشان صفات کا ادراک ہو

اوراس کے حوالہ سے رعب وہیبت کا ایک نقش ہمارے دل میں پایا جاتا ہو، اس کے حوالہ سے ہم کبوتر کی طرح اپنی آنکھیں بند نہ رکھیں، وہ زندہ وجاوید رب موجود ہے، ہماری ہر حرکت اس کے نوٹس میں ہے، ہم اپنے تحفظ کا سامان کرلیں اوراس کے حوالہ سے حساس بن کر زندگی گذاریں۔اس کیفیت کا نام ''تقوی'' ہے۔

یہ کیفیت جس انسان کے اندر بھی ہوگی تو اس کا ضمیر اپنے رب کے حوالہ سے متحرک رہے گا، اس حوالہ سے غلط اور صحیح کی راہ نمائی اس کو دیتا رہے گا اور جب کسی منادی کی آواز سنائی دے گی کہ میں خدا کا رسول ہوں، تم سے دنیا کی کوئی متاع نہیں چاہتا ہوں، بس خدا ہی کے حوالہ سے تمہاری راہ نمائی کرنے کے لیے اور تمہارے اندر عبدیت اور ربانیت کی شان پیدا کرنے کے لیے مبعوث ہوا ہوں تو ممکن ہی نہیں کہ یہ ضمیر انسان کو اس آواز سے لاتعلق رہنے دے۔ خلاصہ معروض یہ ہے کہ خدا کے حوالہ سے تقوی، احتیاط اور حساسیت کی کیفیات انسان کے اندر خود منادیء رسالت کے حوالہ سے بھی حساسیت کی کیفیات پیدا کرتی ہیں، اب خدا کے حوالہ سے انسان کے اندر تقوی کی کیفیت پیدا ہوجائیاور مردہ احساسات میں زندگی کی حرارت پیدا ہوجائے، اس کے لیے تدبرِ کائنات بہترین ''ٹانک'' ہے کیونکہ تقوی کی یہ کیفیت جڑی ہوئی ہے اس نقشِ عظمت کے ساتھ جو انسان کے دل میں ربِ کائنات کے حوالہ سے پایا جاتا ہے، یہ نقش جتنا مضبوط ہوگا، تقوی کی کیفیت بھی اتنی ہی قوی ہوگی اور ہم بتا چکے ہیں کہ خدا کی عظمت کا نقش دل میں پختہ کرنے کے لیے خود قرآن اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سب سے زیادہ اور سب سے بڑا حوالہ کائنات کا دیا گیا ہے۔اب اس تقوی کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ انسان منادیء رسالت کی آواز پر کان دھرے، اس کی نداء کو ''سنی ان سنی'' نہ کرے اور اس کے بارہ میں خبر گیری کر کے ایمان لے آئے، جبکہ ''ایمان بالرسالۃ'' کے بعد اسی تقوی کی کیفیت میں ترقی کی ایسی ایسی راہیں کھلتی ہیں کہ انسان ربانیت کا پیکر اور بذاتِ خود اللہ کی ایک برہان بن جاتا ہے۔اس تقوی کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ قرآن میں درجنوں اور بیسیوں بار مختلف الفاظ میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مثلاً سورہ نساء کے آغاز پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ''اے انسانو! اپنے اس رب سے بچ بچا کر چلو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔۔۔'' یا ''سورہ یس'' میں ارشاد ہے کہ ''آگے اور پیچھے سے اپنا بچاؤ کرتے ہوئے زندگی بسر کرو تاکہ تم مستحقِ رحمت بن سکو'' تو نادان لوگ یقیناً ''بچ بچا کر چلنے'' کی اس ہدایت کا یقیناً کوئی عجیب وغریب مفہوم ہی تراشیں گے مگر ایک سلیم الطبع انسان کی نظر میں اس کا مفہوم بالکل واضح ہے اور وہ وہی ہے جو ہم عرض کر چکے ہیں کہ اپنے اندر خدا کے حوالہ سے حساسیت پیدا کرو، اس کے بارہ میں زندہ ضمیری کا ثبوت دو، ایسے افعال اور رویوں سے اپنی حفاظت کرو جن میں ربِ عظیم کی بے توقیری کا پہلو پایا جاتا ہو اور جن کے نتیجہ میں تمہیں ربِ کائنات کی ناراضی کا سامنا کرنا پڑے۔حکم ہے کہ اس دنیا میں چونکہ اللہ کی بے توقیری کی مختلف شکلوں کا ایک جنگل اگا ہوا ہے، سو اس جنگل کے اندر تم اپنی آنکھیں اپنے رب کے حوالہ سے کھلی رکھو اور ساری زندگی ایسی حساسیت اور احتیاط (تقوی) کے ساتھ گذارو جیسے کوئی آدمی خاردار جھاڑیوں کے پاس سے گذرتے ہوئے خود کو آگے اور پیچھے سے بچاتے ہوئے چلتا ہے یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ جس طرح ایک باخبر اور بارعب ریاست کا عام شہری حاکمِ وقت کے رعب اور ہیبت کی وجہ سے ملکی قوانین کو بائی پاس کرنے کا تصور نہیں کرسکتا یا جب کبھی حاکمِ وقت کے سامنے موجود ہو تو خصوصیت کے ساتھ ایسی سب حرکتوں سے اجتناب کرتا ہے جو اس بارگاہ کی نزاکتوں کے خلاف ہوں۔

اب سوچئے کہ جو آدمی واقعتاً رب کو رب سمجھے گا، کائنات کو اور کائنات میں اپنی موجودگی کو اسی رب کے حوالہ سے دیکھے گا، اس کے حوالہ سے واقعی بچ بچا کر احتیاط سے چلے گا، اس کے معاملہ میں کوئی رویہ اختیار کرتے ہوئے واقعی حساسیت سے کام لے گا تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ خدا کے منادیوں کی آواز کو خاطر میں نہ لائے، ان کی آواز کو سنی ان سنی کردے اور ان کے حوالہ سے کوئی خبر گیری ہی نہ کرے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک آدمی کے دل میں قانون اور ریاست کی تعظیم بھی ہو، لیکن جب اسی قانون اور ریاست کا کوئی نمائندہ اس کے پاس آئے تو وہ اس کی آواز کو سنی ان سنی کردے، اس

کو دروازہ سے ہی دھتکار دے اور اس کے بارہ میں یہ تک خبر گیری نہ کرے کہ کہیں اپنے بارہ میں ریاستی نمائندہ ہونے کا اس کا دعوی مبنی بر حقیقت تو نہیں تھا تا کہ پھر حسبِ حال اس کے ساتھ سلوک کیا جاتا۔ ظاہر ہے ایسی حرکت کوئی ایسا آدمی ہی کر سکتا ہے جس کے دل میں ریاست اور قانون ہی کی کوئی تعظیم نہیں ہے۔ سو رسولوں کا معاملہ خدا سے الگ نہیں ہے، اگر ایک آدمی خدا کی تعظیم پر یقین رکھتا ہے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ خدا کے منادیوں کی آواز کو سنی ان سنی کر دے اور ان کے حوالہ سے اس خبر گیری تک کی ضرورت محسوس نہ کرے کہ کیا یہ منادی اپنے دعوی میں سچا ہے یا جھوٹا۔ لاتعلقی کا یہ انداز کوئی ایسا آدمی ہی اختیار کر سکتا ہے جو خود خدا سے ہی لاتعلق ہے۔

تاہم خدا کی تعظیم کا یہ معنی نہیں کہ اب ہر مدعیٔ رسالت کے سامنے ادب سے سر جھکا دیا جائے، بلکہ خداوند ہی کی تعظیم کے احساس کے ساتھ جس طرح کسی مدعیٔ رسالت کی صداقت واضح ہو جانے کے بعد خود کو اس سے وابستہ کرنا ضروری ہے، بعینہ اسی طرح اگر کسی مدعیٔ رسالت کا جھوٹ اس حوالہ سے ثابت ہوتا ہے تو اسی خداوند ہی کی تعظیم کے احساس کے تحت خدا کا ایک مومن بندہ اپنے آپ کو اس سے دور رکھے گا، اس کے دھوکہ پر لوگوں کو متنبہ کرے گا۔ خدا جب کسی انسان کو اپنا پیغمبر بناتا ہے تو اس کو صداقت کے عام فہم دلائل بھی دیتا ہے اور جب کوئی جھوٹا خود کو اس کا رسول بتاتا ہے تو خدا لوگوں کو اس کے شر سے بچانے کے لیے اس کے جھوٹ کا پول بھی ضرور کھولتا ہے اور یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ درج بالا کلام کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن میں دیگر ایمانی رویوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ، خود رسولوں کی نداء پر لبیک کہنے اور ان کے معاملہ کو اپنے سے متعلق سمجھنے کا احساس پیدا کرنے کے لیے بھی کائنات کا حوالہ دیا گیا ہے۔

قرآنی ورلڈ ویو کی اہمیت وافادیت

چونکہ قرآن خدا کی طرف سے سائنسی اور غیر سائنسی دونوں طرح کے ادوار وافراد کے لیے آخری پیامِ ہدایت بن کر آیا ہے اس لیے اس میں کائناتی جلووں میں سے عموماً صرف اس جہان کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور جس تک رسائی پانے کے لیے انسانی نگاہ کو نہ خوردبین کی ضرورت ہے، نہ ہی دوربین کی، نہ خلائی شٹل کی اور نہ ہی اس کے بھاری بھرکم اخراجات کی، تا کہ ہر کس وناکس اس سے فائدہ اٹھا سکیا ور کسی کو بھی اس سے استفادہ کرنے میں کوئی مانع پیش نہ آئے۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ انسان کی ہدایت کے لیے خود سائنٹفک دور میں بھی صرف اس کھلی آنکھ سے نظر آنے والی کائنات کا مطالعہ کافی شافی ہوگا بشرطیکہ آدمی ہدایت کا طالب ہو، ورنہ خلاو پاتال کے غوطے بھی اس کو فائدہ نہیں دیں گے۔ دوربین ایجاد ہو جانے کے بعد نہ تو یہ جہان انسان کے لیے بے قیمت ہو گیا ہے اور نہ ہی قرآن کی پیش کردہ تصویرِ کائنات نے اپنی قیمت کھوئی ہے۔

جدید انسان کو ایک ہوس لگی ہوئی ہے کائنات کی پنہائیوں میں جھانکنے کی لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جتنا کچھ اللہ نے ہمارے سامنے رکھا ہے اس کا پورا سبق ہم پڑھنے کے لیے تیار نہیں۔ معاش کی تگ ودو سے کچھ وقت نکالئے، انکارِ مذہب کے فیشن کو چھوڑیے اور ہدایت کی طلب کے ساتھ اللہ کی طرف قدم بڑھایئے، دھوپ اور چھاؤں کی طرح آپ کو شکر وکفر کا فرق بھی اسی زمین پر سمجھ آجائے گا اور اللہ خود بڑھ کر آپ سے آملے گا۔ آسمان، تاروں، جھلملاتی کہکشاؤں، چمکتے اجالوں، بہتے نالوں، فلک بوس پہاڑوں، سرسبز گلستانوں، سرد وگرم ہواؤں، بادل سے ابلتے فواروں، سنہری دھوپ اور خنک چھاؤں، خزاؤں وبہاروں، ہوا میں تیرتے بادل کے سائبانوں، ست رنگی چہکاروں، چڑھتے اترتے سورج اور گھٹتے بڑھتے چاند کیا یمان پرور نظاروں، سمندر کی بے قابو امواجوں، ابلتی آبشاروں، خاک سے نکلتے سبزی، اناج اور پھلوں کے رنگ برنگی خزانوں میں آج بھی حیرت واستعجاب کی ایک دنیا موجود ہے، بس جدید انسان کے مزاج میں خلل آ گیا ہے جو یہ موبائل نامی آلہ پر تو حیران ہوتا ہے لیکن کان اور زبان کی تخلیق پر نہیں، دوربین پر حیران ہوتا ہے اور خود اپنی آنکھ پر نہیں، سائنسی کھلونوں پر حیران ہوتا ہے اور انسانی دماغ کی تخلیق پر نہیں، نہ اس عظیم خالق پر جس نے اربوں کی تعداد میں انسانی دماغ بنائے اور ان میں کرشمہ سازی کی صنعت لگائی۔ بند کمروں، مصنوعی روشنیوں

اور جدید تہذیب کی افسوں کاریوں میں پھنسا ہوا انسان اس کائنات کو بچشمِ خود کسی اعلیٰ مقصد کے لیے دیکھنے کو تیار نہیں۔

راہ روانِ سائنس کی زندگی بہت گاڑھے اور عمیق تدبر کے باوجود کنوئیں کے مینڈک کی طرح ہے جو اپنے کنوئیں سے باہر جھانکنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ کہنے کو تو اس وقت انسان کی دریافت کافی ''پرے'' تک پھیل چکی ہے، لیکن اگر ہدایت کا طالب بن کر صرف چاند سورج تک پھیلی ہوئی کائنات کو ہی دیکھ لیا جائے تو یہ انسان کی بصیرت کے لیے نہ صرف کل کافی تھا بلکہ آج بھی کافی ہے۔ سائنس کی غیر معمولی ترقی کے باوجود انسان کی نگاہ مادے سے آگے نہیں جارہی اور اس ترقی کے پیچھے جن لوگوں کا سرمایہ لگا ہوا ہے، انہی کے اغراض ومقاصد اور انہی کمیشن کی تکمیل ہی پیشِ نظر ہے۔ طلبِ ہدایت کے ساتھ اگر وہ صرف کھلی آنکھ سے نظر آنے والی اس کائنات کو ہی دیکھ لیں تو ان کی ہدایت کا سفر آسان ہوسکتا ہے اور یہ کائنات انہیں اسلام کی حقانیت تک پہنچا سکتی ہے۔ لیکن جب کسی کی اغراض مادیت اور معاشی مقاصد سے آگے بڑھتی ہی نہیں ہیں، انکارِ مذہب کو ایک فیشن بنالیا گیا ہے اور کوئی مذہب خواہ کتنا ہی سائنٹفک ہو، اس کی پیروی کو بالعموم دوسری نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے تو ذرا سوچئے کہ اس رویہ کے ساتھ ہدایت کا سفر کیسے آگے بڑھ سکتا ہے۔

یہ کائنات سرچشمۂ نصیحت ہے، اس کے لیے وقت نکالئے اور اللہ کی دی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کبھی کبھی تنہائی میں رہ کر صرف عارفانہ نگاہ سے اس کو دیکھئے، دین ومذہب کے بارہ میں آپ کے بہت سے سوالات خود بخود آپ کی جان چھوڑ جائیں گے۔ کائناتی نقشوں میں جب ایک بار آپ خدا کی صناعی کے جلوے دیکھنے کے عادی ہوگئے تو پھر سائنس کی مصنوعی روشنیاں بھی آپ کے لیے حجاب نہیں بنیں گی، ان روشنیوں میں بھی خدا ہی کا وجود دِکھے گا، جو سائنسی کھلونوں کا خمار آج سر پہ سوار ہے وہ اتر جائے گا اور یہ سائنس سے قبل سائنس دانوں کے خالق ورب کی ہی یاد دلائیں گے، اس کے بارہ میں سوچنے کی اہمیت کا احساس دلائیں گے اور اس کے معاملہ کو خود سے غیر متعلق سمجھنے کے جدید فیشن پر آپ کو چوکنا کریں گے۔

اگر عارفانہ نگاہ کے ساتھ اس کائنات کو دیکھنے کی حس انسان میں بیدا ہوجائے (جو بدقسمتی سے مصنوعی طرزِ زندگی کی وجہ سے بے ہوش ہوئی پڑی ہے) تو چُلو بھر پانی بھی انسان کی آنکھوں کو جکڑ لیتا ہے، کائنات کے وہ چھوٹے چھوٹے رنگ جنہیں ہم معمولی سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں وہ انسان کو اپنی گرفت اور ٹرانس میں لے لیتے ہیں، دو چار دن تک اگر آدمی آسمان کو، سورج کو اور اڑتی پھدکتی زندگی کے رنگوں کو درس وعبرت کی نگاہ سے نہ دیکھ پائے تو اس کو اپنے اندر ایک خلا محسوس ہوتا ہے، دیکھ لے تو گذرا ہوا وقت یوں لگتا ہے کہ جیسے کسی قفس میں گذرا ہو اور اس راہ سے اسلامی ایمانیات کا تیقن حاصل ہونے کے بعد آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ اسلام اور خدا کے اسلامی تعارف کی حقانیت اتنی پیچیدہ اور مبہم نہیں جتنی کہ ہم نے سمجھ رکھی ہے اور یہ کہ اس کا ادراک کرنے کے لیے تو بس ہوش وحواس کی سلامتی درکار ہے۔

ہم لوگ چونکہ بچپن سے اس کائنات کو سرسری نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں اس لیے بڑے ہوکر بھی اسے بس سرسری نگاہ سے ہی دیکھتے ہیں اور ایمان ومعرفت کی معراجی کیفیات کا ہمیں تجربہ نہیں ہوتا، ورنہ یہ جیتا جاگتا جہان جو ہمارے سامنے موجود ہے، ایک عظیم الشان مشاہدہ کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ہم حقیقت پسندی کی آنکھ کھولیں اور ذرا سنجیدگی سے اس کو دیکھتے رہا کریں تو رفتہ رفتہ منظر صاف ہوگا، آنکھیں ماحول سے مانوس ہوں گی اور ہمیں اندازہ ہوگا کہ ہم آج تک کتنی بڑی حقیقت اور کتنے حیران کن مشاہدہ سے محروم رہے۔

گذشتہ گفتگو سے ہمارا یہ مقصود قطعاً نہیں ہے کہ سائنس فی اصلہ اسلام کی حریف ہے یا اسلام سائنس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے، اگر کسی کو یہ تاثر ملا ہے تو اس کے لیے دعائے خیر ہی کی جاسکتی ہے۔ ہمارا مقصود فقط یہ رہا ہے کہ جدید انسان کو مصنوعی روشنیوں کی تنگ ناؤ سے نکل کر اس وسیع وعریض کائنات کے رنگوں کو خود اپنے حواس کے ذریعہ سے محسوس کرنا چاہئے، اس سے بصیرت میں بے پناہ اضافہ ہوگا اور دوسرا یہ کہ اسلام اپنی صداقت کے اثبات کے

لیے جدید سائنسی حوالوں کا محتاج نہیں، اگر چہ خود ان کی وجہ سے بھی اسلام کے ہی موقف کو مزید تقویت ملتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں، تاہم جو طاقت بچشمِ خود اور بچشمِ تدبر کائنات کو دیکھنے میں ہے، اس کا کوئی بدل نہیں۔ گذشتہ گفتگو سے مقصود صرف یہی ہے۔

آخری بات

کائنات کا حوالہ جو قرآن میں ایک تسلسل کے ساتھ دیا جاتا ہے، وہ ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرہ سمیت انسان کے تمام تر ایمانی رویوں کی اصلاح کے لیے گویا بیک وقت مفید ہے اور یہ سب ایمانی حقائق نہایت موٹے حروف کے اندر کائناتی اوراق پر لکھے ہوئے ہیں۔ مندرجہ بالا سطور میں ہم نے اس تدبر کے منہج کو قرآنِ کریم کی روشنی میں واضح کیا ہے اور اس کے نتائج کو عقلی ولفظی ضابطوں کی شکل میں بیان کیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ان ضابطوں کے بیان میں کوئی جھول رہ گیا ہو، قاری کو یہ جھول ڈھونڈنے اور ان پر تنقید کے نشتر تیز کرنے کی بجائے عملا تدبرِ کائنات کی طرف قدم بڑھانا چاہئے۔ تدبر کی تاثیر کا صحیح اندازہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب آدمی عملا تدبر کرے اور اسے اپنے روزمرہ وظائف میں شامل کرے۔

ہم نے یہاں وجودِ باری تعالی، توحید، رسالت اور آخرت کے بارہ میں تدبر کے مختلف مناہج الگ الگ بیان کیے ہیں جن سے محسوس ہوتا ہے کہ شاید تدبر کی ان تمام انواع کے لیے الگ الگ بساط بچھانے کی ضرورت ہے، مگر فی الواقع یہ جدا جدا نہیں، بلکہ ایک ہی شجر کے برگ وبار ہیں، طالبِ حق کا تدبر آہستہ آہستہ اس کے دل کی سیاہی کو دور کرتا ہے اور الوہی نظام کے حوالہ سے قرآنی منہج کے مطابق کیا گیا اس کا تدبر اسے مذکورہ تمام اسلامی ایمانیات کے حوالہ سے ایک زبردست تجربہ سے روشناس کراتا ہے۔ مذکور الصدر ضابطے شاید کسی کو پڑھنے میں کچھ مشکل محسوس ہوئے ہوں، مگر کائناتی تدبر اور اس کے نتائج بالکل سہل الحصول اور نیم بدیہی شان کے حامل ہیں، عملا تدبر کی راہ پر چلنے والا شخص خواہ کوئی بدو ہو یا بہت بڑا مفکر، اسلامی ایمانیات کو صرف عقلی اثبات کی صورت میں نہیں، بلکہ ایک نیم بدیہی احساس کی صورت میں اپنے اندر موج زن پاتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ جس خدا نے مجھے پیدا کیا اور یہ سب کچھ پیدا کیا ہے، پیدا کر کے ست رنگی نعمتوں کے جھولے میں ڈالا ہے، کیا اس کا حق نہیں کہ اس کے نبیوں کی صداقت اگر الم نشرح ہو جائے تو میں ان کی طرف گوش برآواز ہو جاؤں، کائناتی حقیقت، انسان کی حیثیت اور خدا کے معاملہ کی سائنٹفک نوعیت کے حوالہ سے جو وہ ہمیشہ ارشادات فرماتے رہے ہیں، انہیں دل کی کھڑکی کھول کر سن لوں، کائنات کا خالق ومالک یقین کرتے ہوئے اس کی وسعت علمی اور وسعتِ اختیاری پر ایمان لے آؤں، اس کی عزت وعظمت کے معاملہ کی حساسیت کو سمجھ لوں، اس کے ارحم الراحمینی کے مناظر دیکھنے کے لیے منفی طرزِ نگاہ کی عینک اپنی آنکھوں سے اتار لوں، اس کے بے نیازی وکرم نوازی اور عزت ورحمت کے دونوں معاملے سمجھ لوں، اس کے خلاف زبان درازی کرنے، اس کے معاملہ کو خود سے غیر متعلق سمجھنے، اس کی قدرت وعظمت پر سوالیہ نشان لگانے، صداقت سے مسلح اس کے سچے نبیوں کے انکار کی روش اختیار کر کے اس کی غیرت وعزت کو للکارنے اور اپنی اوقات کو بھول جانے کے طرز سے بچ جاؤں؟؟

جس نے بن مانگے اتنا کچھ دیا ہے، نعمتوں کی ناقدری کے باوجود ان کا باب بند نہیں فرمایا، ہماری تمام تر بے وقعتی اور اپنی تمام تر عظمت وقدرت کے باوجود ہماری ناقدریوں کی وجہ سے اس نے ہمارے اوپر شب وروز کا سلسلہ بند نہیں فرمایا، زندگی کی راہیں کھولتا گیا اور سوچنے سمجھنے کے مواقع دیتا گیا، اگر ہم اس کے وفا شعار بن جائیں تو وہ حلیم وصبور ہمیں کیا کچھ نہ دے گا؟ اگر یہ سچ ہے تو پھر نبیوں کی دعوت کو جھٹلانے کا آخر کیا جواز ہے؟ نبیوں نے آکر یہی کچھ تو فرمایا ہے، خدا کو راضی کرنے کا طریقہ بتلایا ہے، اس سے وفا کا قرینہ سکھایا ہے، اس کی بندگی خود کر کے دکھایا ہے اور بالکل سائنٹفک انداز میں اس کے ثابت شدہ تعارف پر ایمان لانے اور اس کی ذات کو ناپختہ اندازوں کی مشق گاہ بنانے کی حساسیت سے آگاہ فرمایا ہے۔ سبحان ربك رب العزة عما يصفون، وسلام على المرسلين، والحمد لله رب العلمين۔

☆☆☆

□ نقطۂ نظر

علماء دیوبند اور غیر مقلدین کے مابین اختلافات
تحفۃ الأحوذی اور معارف السنن کے تناظر میں

حافظ انس بلال
ریسرچ فیلو شعبۂ دینیات سنی
اے ایم یو، علی گڑھ

حدیثوں کی روایت عام طور سے بالمعنیٰ ہوتی ہے نیز حدیثوں میں ناسخ ومنسوخ بھی ہوتا ہے، احادیث کا تعلق بعض دفعہ کچھ مخصوص اشخاص اور مخصوص اوقات کے ساتھ ہوتا ہے اسی طرح حدیث کے الفاظ بعض دفعہ ایک سے زائد معنی پر دلالت کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ فیصلہ کرنا کہ یہ حدیث قابل عمل ہے یا نہیں؟ ہے تو کس حد تک؟ انتہائی مشکل ہے۔ چنانچہ فقہائے کرام جن کا تعلق قرون اولیٰ سے ہے انہوں نے اپنی پوری محنت اور صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف اور متعارض نصوص سے حکم شرعی مستنبط کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور اس کے کچھ اصول وضع کیے ہیں جو قرآن وحدیث ہی سے ماخوذ ہیں، ظاہر بات ہے کہ یہ اجتہادی کوششیں ہیں جن کے نتیجہ میں اختلاف کا پایا جانا لازمی امر ہے جو از روئے شرع محمود و پسندیدہ ہے۔

مولانا مودودیؒ رقم طراز ہیں:

''.....قرآن اُس صحت بخش اختلافِ رائے کا مخالف نہیں ہے جو دین میں متفق اور اسلامی نظام جماعت میں متحد رہتے ہوئے محض احکام وقوانین کی تعبیر میں مخلصانہ تحقیق کی بنا پر کیا جائے، بلکہ وہ مذمّت اُس اختلاف کی کرتا ہے جو نفسانیت اور کج نگاہی سے شروع ہو اور فرقہ بندی و نزاعِ باہمی تک نوبت پہنچادے۔ یہ دونوں قسم کے اختلاف نہ اپنی حقیقت میں یکساں ہیں اور نہ اپنے نتائج میں ایک دوسرے سے کوئی مشابہت رکھتے ہیں کہ دونوں ایک ہی لکڑی سے ہانک دیا جائے۔ پہلی قسم کا اختلاف تو ترقی کی جان اور زندگی کی روح ہے۔ وہ ہر اُس سوسائٹی میں پایا جائے گا جو عقل وفکر رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔ اس کا پایا جانا زندگی کی علامت ہے اور اس سے خالی صرف وہی سوسائٹی ہوسکتی ہے جو ذہین انسانون سے نہیں بلکہ لکڑی کے کُندوں سے مرکّب ہو۔ رہا دوسری قسم کا اختلاف، تو ایک دنیا جانتی ہے کہ اس نے جس گروہ میں بھی سر اٹھایا اس کو پراگندہ کرکے چھوڑا۔ اس کا رونما ہونا صحت کی نہیں بلکہ مرض کی علامت ہے، اس کے نتائج کبھی کسی امت کے حق میں بھی مفید نہیں ہوسکتے''۔(۱)

فقہی اختلافات میں حدیث نبوی کی تاثیر کہاں تک ہے؟ اور حدیث ہی کی بنیاد پر اختلافات کیوں کر ہوسکتے ہیں؟ اس موضوع پر بہت سے علماء نے گراں قدر کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، جن میں حافظ ابن تیمیہؒ کی ''رفع الملام''، شاہ ولی اللہ

محدّث دہلویؒ کی ''الإنصاف فی بیان سبب الاختلاف'' اور ''عقد الجید فی بحث الاجتھاد والتقلید'' اور شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ کی ''اِختلاف الأئمۃ'' (اردو) اہمیت کی حامل ہیں۔فی زمانہ مشہور محقق شیخ محمد عوّامہ نے اس موضوع پر اپنی شاہکار تصنیف ''أثر الحدیث الشریف فی اختلاف الائمۃ الفقھاء'' تالیف کر کے موضوع کا حق ادا کر دیا جسے علماء نے نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھا بلکہ حرف بحرف اس کی تائید بھی کی۔

حدیثوں کی بنیاد پر رونما ہونے والے اختلافات کے اسباب چار ہو سکتے ہیں:

۱۔ حدیث شریف کے قابل عمل ہونے کا فیصلہ کرنے میں اختلاف کا پایا جانا۔

۲۔ حدیث شریف کے سمجھنے میں اختلاف کا پایا جانا۔

۳۔ باہم متعارض حدیثوں میں جمع وتطبیق یا ترجیح یا نسخ کا فیصلہ کرنے میں اختلاف کا پایا جانا۔

۴۔ جن احادیث پر حکم کا مدار رکھا جاتا ہے فقیہ کے پاس ایسی احادیث میں کمی بیشی کا پایا جانا۔(۲)

احناف اور اہل حدیث/غیر مقلّدین کے درمیان اختلاف وکشمکش:

اصطلاح جدید میں جماعت ''اہل حدیث'' سے مراد ہندو پاک کا ایک معروف دینی حلقہ وفقہی مسلک ہے جو جمہور اہل السنّہ مسلمانوں سے ترکِ تقلید پر مختلف ہے اور حدیث سے براہ راست نسبت کا مدّعی ہے۔ بنیادی عقائد میں یہ حضرات زیادہ تر اہل سنت والجماعت کے ساتھ ہیں، ان کے حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ سے تقریباً اسی قسم کے فروعی اختلافات ہیں جس طرح کے اختلافات مذاہب اربعہ میں آپس میں ہیں۔ کچھ ایسے اختلافات بھی ہیں جن میں یہ چاروں اماموں کے خلاف ہیں جیسے ایک مجلس میں طلاق ثلاثہ کو ایک ہی طلاق ماننا، آٹھ رکعت تراویح پڑھنا وغیرہ۔(۳)

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جن علمائے اہل حدیث نے شہرت پائی ان میں میاں سید نذیر حسینؒ کے بعد نواب سید صدیق حسن قنوجی ثم بھوپالی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے زمانے میں بھوپال اہل علم کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولانا عبد الرحمٰن محدث مبارک پوریؒ کے استاذ مولانا سلامت اللہ صاحب جیراج پوری، نواب صدیق حسن خاں ہی کے بلانے پر بھوپال گئے تھے اور وہاں کے مدارس کے سربراہ بنائے گئے، مولانا سلامت اللہ صاحب بھی مسلک اہل حدیث کے زبردست ترجمان تھے، علامہ شبلی نعمانی (جو ان کے پڑوسی اور کٹر حنفی تھے) سے ان کے اکثر مناظرے اور مباحثے ہو کرتے تھے، علامہ شبلی نے مولانا سلامت اللہ صاحب کے کسی رسالہ کے جواب میں اپنا رسالہ ''ظل الغمام فی مسئلۃ القرائۃ خلف الامام'' لکھا، اس میں پہلے اپنے مدعا یعنی ترک قرأت کو قرآن وحدیث سے ثابت کیا ہے اور آخر میں مخالف کے حدیث وفقہ کے حوالوں اور دلیلوں کی غلطی دکھائی ہے۔

اس زمانے میں ایک طرف نواب صدیق حسن خاں اہل حدیث اسکول کی سرپرستی فرما رہے تھے تو دوسری طرف مولانا عبد الحئ صاحب فرنگی محلی حنفی اسکول کی۔ ان دونوں کے درمیان علمی مباحثے ہوتے اور ایک دوسرے کے رد میں رسائل اور کتابیں لکھی جاتیں یہاں تک کہ اس اختلاف نے بڑی شدت اختیار کر لی تھی۔(۴)

اس وقت مسلکی اختلافات کی جو گرم بازاری تھی اس کا نقشہ مولانا عبد الحئ صاحب فرنگی محلی متوفی ۱۳۰۴ھ نے اپنی کتاب ''امام الکلام'' میں کھینچا ہے، پھر علمائے اہل حدیث اور علمائے احناف کی بیجا حرکتوں سے اور ان کے باہمی نزاع و جدال سے اللہ کی پناہ مانگی ہے اور ان کے لئے ہدایت وصلاح کی دعا کی ہے۔(۵)

مولانا مبارک پوری کے معاصر مولانا ظہیر احسن شوق

نیموی متوفی ۱۳۲۲ھ مولانا عبد الحئ فرنگی محلی کے نامور شاگردوں اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے معاصرین میں سے تھے، مولانا مبارک پوری نے ان دونوں حضرات کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا تھا، بالخصوص مولانا نیموی سے تو ان کے شدید علمی اختلافات تھے اور اپنی تصنیفات میں جگہ جگہ ان کی تردید کی ہے، کئی رسائل تو انہیں کے رد میں لکھے ہیں، ان میں سب سے مشہور ''ابکار المنن'' ہے جو مولانا نیموی کی ''آثار السنن'' کے جواب میں لکھی گئی ہے، علامہ کشمیری نے ''آثار السنن'' کا حاشیہ ''الاتحاف لمذھب الاحناف'' کے نام سے لکھا (۶)۔ ذیل میں قرائت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ پر علماء دیوبند کی طرف سے اہل حدیث مسلک کے علماء کے جواب اور رد میں لکھی گئیں کتابوں کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ دونوں مکتبۂ فکر کے علماء کے درمیان اپنے اپنے فقہی مسلک کے دفاع اور مخالف کے مسلک کے رد و مخالفت کا رجحان کتنی گہرائی کے ساتھ جڑ پکڑ گیا تھا۔

قرائت فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ ابتداء سے مختلف فیہ اور معرکۃ الآراء رہا ہے، اس مسئلہ کو نماز کے اختلافی مسائل میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس میں اختلاف افضلیت اور عدم افضلیت کا نہیں جواز و عدم جواز بلکہ وجوب و تحریم کا ہے، چنانچہ اس مسئلہ پر قلمی اور زبانی مناظرات کا بازار گرم رہا ہے اور اس موضوع پر فریقین کی طرف سے اتنی تصانیف لکھی گئی ہیں جن سے ایک پورا کتب خانہ تیار ہوسکتا ہے۔ اس موضوع پر غالباً سب سے پہلی مستقل کتاب امام بخاریؒ نے ''جزء القرائۃ خلف الإمام'' کے نام سے لکھی ہے اور ان کے بعد امام بیہقیؒ نے ''کتاب القرائۃ'' تحریر فرمائی، اُس ابتدائی دور میں کسی حنفی عالم کی اس موضوع پر کسی مستقل کتاب کا ذکر نہیں ملتا البتہ امام بیہقیؒ اپنی کتاب القرائۃ میں بکثرت ایک حنفی عالم کی تردید کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء احناف میں سے کسی نے اس مسئلہ پر امام بیہقی سے پہلے کوئی کتاب لکھی تھی، آخری دور میں جب غیر مقلدین نے اس مسئلہ کو بہت موضوع بحث بنایا اور اس کی وجہ سے حنفیہ کے خلاف محاذ قائم کیا اور ان کی نمازوں کے فاسد ہونے کا اعلان کیا تو علماء ہند نے اس کے جواب میں متعدد کتابیں اور رسالے تالیف کیے چنانچہ علامہ عبد الحی لکھنویؒ نے ''امام الکلام فی القرائۃ خلف الامام'' اور اس کا حاشیہ ''غیث الغمام فی القرائۃ خلف الامام'' تحریر فرمایا، مولانا قاسم نانوتویؒ نے ''الدلیل المحکم فی ترک القرائۃ للمؤتم'' اور ''توثیق الکلام فی ترک القرائۃ خلف الامام''، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ''ھدایۃ المعتدی فی قرائۃ المقتدی''، مولانا احمد علی سہارنپوریؒ نے ''الدلیل القوی علی ترک القرائۃ للمقتدی''، شیخ محمد ہاشم سندھی نے ''تنقیح الکلام فی القرائۃ خلف الامام'' اور رلامہ ظہیر حسن نیمویؒ نے متعدد رسالے تحریر فرمائے، علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے ایک رسالہ فارسی زبان میں ''فصل الخطاب فی مسئلۃ اُم الکتاب'' پھر دوسرا رسالہ عربی میں ''خاتمۃ الخطاب فی مسئلۃ فاتحۃ الکتاب'' تحریر فرمایا، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے بھی ''فاتحۃ الکلام فی القرائۃ خلف الامام'' تحریر فرمایا، آخر میں مولانا سرفراز خان صاحب نے ''احسن الکلام فی ترک القرائۃ خلف الامام'' کے نام سے دو جلدوں میں اس موضوع پر کتاب لکھی جسے اس موضوع کے مباحث کا جامع ترین ذخیرہ کہنا چاہیے۔(۷)

علامہ مبارکپوریؒ کا شرح ترمذی میں احناف پر طعن وتنقید کرنا:

محدّث مبارکپوریؒ کا تعلق ''اہل حدیث'' مسلک سے تھا، جماعت اہل حدیث برصغیر ہند میں نسبتاً ایک نیا مسلک ہے جبکہ ہندوستان میں شروع سے اکثریت احناف کی رہی ہے، مسلم دور حکومت میں بھی سرکاری مذہب کا درجہ ''فقہ حنفی'' کو حاصل تھا اور قضاۃ کے عہدوں پر امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے پیروکار ہی متمکن رہے۔(۸)

انیسویں صدی میں علماء احناف زیادہ تر ''مدرسہ دیوبند'' سے تعلق رکھتے تھے جن کی شروح حدیث اور فقہ وتفسیر پر اہم تصنیفات وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتی رہی ہیں۔ برصغیر ہند میں جب اہل حدیث مسلک یا غیر مقلّدین کا مکتب فکر وجود میں آیا تو ان کا مسلکی اختلاف زیادہ تر علماء دیوبند سے رہا جو مسلک احناف کے پرزور حامی و نمائندے تھے، طرفین نے ایک دوسرے کے رد میں بے شمار کتابیں اور بیسیوں رسالے تصنیف کیے، ان کے اختلافات کا دائرہ زیادہ تر چند مشہور مختلف فیہ مسائل جیسے آمین بالجہر، رفع یدین، قرائت خلف الامام وغیرہ کے گرد گھومتا ہے، میاں نذیر حسین محدّث دہلویؒ اور نواب صدّیق حسن خان قنّوجیؒ کے بعد محدّث مبارک پوریؒ کا شمار جماعت اہل حدیث کے بڑے نمائندہ علماء میں ہوتا تھا، اس لئے یہ فطری بات ہے کہ ان اختلافات کی آنچ سے وہ اپنا دامن کیسے بچا سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کثرت سے اپنے معاصر علماء احناف پر تنقید کی ہے اور ان کی شرح ترمذی میں مسلکی اختلافات کی مثالیں جابجا دیکھی جاسکتی ہیں۔

تحفۃ الأحوذی کے مصنف علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ اکثر مسائل میں احناف کو اپنا حریف ومقابل مانتے ہیں، خاص طور پر مشہور ومعروف مسائل میں جیسے قرائۃ خلف الامام، رفع یدین، آمین بالجہر وغیرہ۔ اس طرح کے مسائل میں شارح ترمذی احناف کی تردید ومخالفت کرتے ہیں اور اپنے مسلک کو راجح وافضل قرار دینے میں اپنی پوری طاقت صرف کردیتے ہیں، ذیل میں اس کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

محدّث مبارکپوریؒ احناف کی مخالفت میں کہیں کہیں جادۂ اعتدال سے ہٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہ طریقہ علم وتحقیق کے بالکل شایان شان نہیں ہے۔ اس کی ایک مثال ''باب ما جاء إذا أمّ أحدكم الناس فليخفّف'' میں حضرت ابو ھریرہؓ کی حدیث ''إذا أمّ أحدكم الناس فليخفّف، فإن فيهم الصغير و الكبير و الضعيف و المريض، فإذا صلّى وحده فيصلّ كيف شاء''(۹) کی تشریح کے ذیل میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، شارح ترمذی علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا قول نقل کرتے ہیں:

''قال صاحب "العرف الشذى" الحنفى: ظهور التخفيف إنما يكون فى القرائة لا فى الركوع و السجود و تعديل الأركان ما هو معلوم من فعل صاحب الشريعة'' انتهى .

اس پر محدّث مبارکپوریؒ ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو حقیقت سے کوسوں دور ہے اور وہ مقلدّین خاص طور پر احناف سے مخالفت پر مبنی ہے:

''لكن أكثر الحنفية يخالفون فعل صاحب الشريعة هذا فيخففون فى الركوع و السجود غاية التخفيف حتى يكون سجودهم كنقر الديك و أما تعديل الأركان فلا يخففون فيه بل يتركونه رأسا فهداهم الله تعالى إلى فعل صاحب الشريعة الذى قال: صلّوا كما رأيتمونى أصلّى''۔(۱۰)

انصاف کی بات یہ ہے کہ تعدیل ارکان میں کمی کسی کا انفرادی عمل تو ہوسکتا ہے جو کہ سراسر ممنوع وناپسندیدہ ہے لیکن اس کو بنیاد بنا کر احناف کی اکثریت کو الزام دینا کہاں تک صحیح ہے؟ اور نہ ہی چند جاہل عوام کے عمل کی ذمہ داری علامہ کشمیریؒ پر تھوپنا دانشمندی ہے، اہل خرد اس کا خود فیصلہ کرسکتے ہیں نسأل اللہ لنا ولہ المغفرۃ۔

علامہ بنوریؒ کا معارف السنن میں فقہ حنفی کی خدمت کا سبب:

برّصغیر ہند میں صدیوں سے امام ابوحنیفہؒ کے فقہی مسلک کی پیروی کی جاتی رہی ہے، اورنگ زیب عالم گیرؒ کے دور میں ''فتاویٰ عالم گیری'' کے نام سے فقہ حنفی پر مشتمل فتاویٰ کو مرتّب

کرنے کا کام کیا گیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلکِ احناف کو مسلم دورِ حکومت میں سرکاری سرپرستی حاصل رہی ہے، اسی وجہ سے ہندوستان کے اکثر حصوں میں اسی مسلک کو عوام و خواص دونوں طبقوں میں قبول عام حاصل ہوا۔

اس سلسلہ میں نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں:

''خلاصہ حال ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ ہے کہ جب سے یہاں اسلام آیا ہے چونکہ اکثر لوگ بادشاہوں کے طریقہ اور مذہب کو پسند کرتے ہیں۔اس وقت سے آج تک یہ لوگ (ہندوستان کے مسلمان) مذہب حنفی پر قائم رہے ہیں اور اسی مذہب کے عالم اور فاضل اور قاضی اور مفتی اور حاکم ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک جم غفیر نے مل کر فتاویٰ ہندیہ کو جمع کیا اور اس میں شاہ عبدالرحیم صاحب والدِ بزرگوار شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ بھی شریک تھے''۔(۱۱)

ہر مسلک کی طرح جماعت اہل حدیث میں کچھ ایسے متعصب و تنگ نظر افراد شامل ہوگئے جو سرِ عام عوام النّاس کو تقلید ائمہ سے برگشتہ کرنے لگے اور انہوں نے عوام کے طبقہ میں امام ابوحنیفہؒ کی ذات و مذہب کے تعلق سے شکوک وشبہات پیدا کردیے جس سے عام مسلمانوں میں تفرقہ وانتشار پھیلنے لگا اور سادہ لوح عوام کا دین وشریعت سے اعتماد متزلزل ہونے لگا، اور فریقین میں فروعی مسائل پر اتنے اختلافات ہوئے کہ بات مجادلہ ومناظرہ بازی سے بڑھ کر مقاتلہ اور ایک دوسرے کی تکفیر تک پہنچ گئی۔

مولانا عبدالحی حسنیؒ نے ''نزھۃ الخواطر'' میں اس کا خوب نقشہ کھینچا ہے، لکھتے ہیں:

''.....مولانا حسین احمد بٹالویؒ نے مقلّدین ائمہ اربعہ خصوصاً احناف کے خلاف شدّت اختیار کی اور اس میں ایسے تعصّب سے چلے کہ اسے پسندیدہ نہیں کہا جاسکتا۔ پس اس سے فتنے بھڑک اٹھے اور احناف اور فرقہ اہل حدیث کے مابین مخالفت زیادہ ہوگئی۔مناظرے، مکابرہ، مجادلہ بلکہ مقاتلہ تک بات پہنچ گئی۔ پھر جب آپ بڑی عمر کو پہنچے اور آپ نے دیکھا کہ مقلّدین سے یہ کھچاؤ ضعف اسلام کا باعث کا سبب ہوگیا ہے اور مسلمان رسوائی اور بدبختی کے گڑھے میں جارہے ہیں، آپ پھر اس طرف لوٹے جو مسلمانوں کے لیے اس حالت میں بہتر تھا.....''۔(۱۲)

چنانچہ علماء احناف نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ وہ مذہب حنفی پر لگائے گئے بے بنیاد الزامات کا علمی وتحقیقی انداز میں جواب دیں اور امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی دلائل وبراہین کی روشنی میں تحقیق وتشریح کا کام انجام دیں تاکہ مذہب حنفی کے پیروکار مطمئن ہوجائیں کہ وہ بھی شریعت اسلامی کی پیروی کررہے ہیں اور دیگر مذاہب فقہیہ کی طرح ان کا مذہب بھی قرآن وسنت میں موجود پختہ دلائل اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔

اسی تناظر میں ہمیں ''معارف السنن'' میں مولانا یوسف بنّوریؒ کے ذریعہ فقہ حنفی کی خدمت کو دیکھنا چاہیے کہ درحقیقت انہوں نے شرح ترمذی تالیف کرکے مذہب حنفی کی تشریح و تفصیل کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ خاص طور سے ان مشہور اختلافی مسائل پر جن کو بنیاد بنا کر غیر مقلّدین حضرات مذہب حنفی کو طعن وتشنیع کا نشانہ بناتے ہیں تفصیلی بحث کی ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے نقطہ نظر کو عقلی ونقلی دلائل کے ساتھ مزیّن کرکے پیش کیا ہے، حتی کہ یہ موضوعات اتنے صفحات پر پھیل گئے ہیں کہ انہیں طوالت کے سبب مستقل رسالے کی شکل میں شائع کیا جانا چاہیے۔مثال کے طور پر:

قرائت خلف الامام کا مسئلہ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، مسئلہ رفع یدین عندالرکوع و بعدہ تقریباً پچاس صفحات پر

محیط ہے، اور آمین بالجہر کا مسئلہ تقریباً ۳۰ رصفحات پر پھیلا ہوا ہے۔(۱۳)

حواشی

(۱) مقدمہ تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، اشاعت مارچ/ ۲۰۱۸ء، جلد اول ص ۳۸، عمر بن عبد العزیزؒ نے اس سلسلہ میں ایک بہت ہی عمدہ بات کہی ہے: "**ما سرّنی أن أصحاب محمد صلی الله علیه و سلّم یختلفون؛ لأنهم لو لم یختلفوا، لم تکن رخصة**"۔(خطابی، کشف الخفاء، ۱/۶۵۔۶۶)

(۲) شیخ محمد عوامہ، أثر الحدیث الشریف فی اختلاف الائمۃ الفقهاء، دار البشائر الإسلامیۃ، بیروت، طبعہ رابعہ ۱۹۹۷ء، ص ۲۷۔۱۹۲

(۳) اہل حدیث حضرات کی تاریخ کے لئے ملاحظہ ہو: تحریکِ اہل حدیث تاریخ کے آئینے میں، مؤلفہ قاضی محمد اسلم سیف فیروزپوری، تاریخ اھل حدیث، مؤلفہ محمد ابراہیم برسیالکوٹی، تاریخ اہل حدیث (تین جلدوں میں) ڈاکٹر بہاؤالدین وغیرہ۔

(۴) اس کے باوجود جب مولانا عبدالحئی صاحب کے انتقال کی خبر نواب صدیق خاں صاحب کو ملی تو انہوں نے اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ لیا اور کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے، پھر سر اٹھایا تو ان کی آنکھیں اشک بار تھیں اور زبان پر مولانا کے لئے دعائیہ کلمات جاری تھے، پھر فرمایا: ''الیوم غربت شمس العلم وقال: ان اختلافنا کان مقصورا علی تحقیق بعض المسائل، ثم اعلن الصلوٰۃ علی الغائب''۔(عبدالحی حسنی، نزہۃ الخواطر، ۸/۱۹۳) آج علم کا آفتاب غروب ہوگیا، اور فرمایا: ہمارا ان کا اختلاف صرف بعض مسائل کی تحقیق کی حد تک تھا، پھر مولانا کے لئے غائبانہ نماز جنازہ کا اعلان فرمایا۔ نیز دیکھیے: مقدمہ الاجوبۃ الفاضلۃ لأسئلۃ العشرۃ الکاملۃ لعبدالحیی لکھنوی، عبد الفتاح ابوغدہ، مطبوعہ حلب

(۵) غلام مرسلین، مولانا عبدالحئ فرنگی محلی: حیات وخدمات، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۸۵ء، ص ۹۵

(۶) ڈاکٹر عین الحق قاسمی، مولانا محمد عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری: حیات وخدمات، ص ۲۷۔۳۰

(۷) درس ترمذی، فیصل پبلیکیشنز، دیوبند، جلد دوم ص ۷۱۔۷۲

(۸) شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر، فرید بکڈپو، نئی دہلی، ص ۱۳۶۔۱۳۷، ۱۳۹، رُودِکوثر، ص ۴۷۷۔۴۷۸

(۹) جامع ترمذی، رقم الحدیث: ۲۳۶

(۱۰) تحفۃ الأحوذی، مکتبہ فیصل، دیوبند، ۱/۵۴۰

(۱۱) نواب صدیق حسن خاں، ترجمان وہابیہ، ص ۲۰، بحوالہ: آثار الحدیث، ڈاکٹر خالد محمود، حصہ دوم، ص ۳۶۴

(۱۲) نزہۃ الخواطر، جلد ۸

(۱۳) معارف السنن ۲/۳۸۲۔۳۹۶، ۳/۱۸۳۔۲۹۰، ۳/ ۴۵۱۔۵۰۱، ۲/۳۹۷۔۴۳۱، مولانا بنّوریؒ کا ان موضوعات پر طویل کلام کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے استاد علامہ کشمیریؒ نے ان مسائل پر مستقل رسالے تصنیف کیے تھے، جیسے قرائت خلف الامام پر ''فصل الخطاب فی مسئلۃ أم الکتاب''، رفع یدین پر ''نیل الفرقدین فی مسألۃ رفع الیدین''، صلاۃ وتر پر ''کشف الستر عن صلاۃ الوتر'' کے نام سے ان کے رسالے موجود ہیں اور یہ تمام رسالے ۱۳۹۶ھ میں کراچی سے ''رسائل الکشمیری'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں، چنانچہ ان کے شاگرد رشید نے اپنے استاد کے علوم ومعارف کو اپنی شرح ترمذی میں منقّح ومرتّب انداز میں پیش کرنے کا کام کیا ہے۔

☆☆☆

□ تعلیم و تربیت

سزا کے سلسلہ میں کچھ عمومی نصیحتیں

تلخیص وترجمانی

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

بہتر یہ ہے کہ سزا کا استعمال کم سے کم کیجئے، بہت سے بچے ایسے ہوتے ہیں جن میں سزا کے سبب سرکشی میں اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ سزا کو ایک معرکہ یا ایک ایسی کشمکش تصور کرتے ہیں جو ان کے اور ان کے والدین کے درمیان برپا ہو، اس لیے پھر وہ عدم تنازل (پیچھے نہ ہٹنے) اور عناد کے ذریعہ غلبہ پانے کی کوشش کرتے ہیں، پھر اس طرح جو بچہ سزا کا عادی ہوجاتا ہے اس پر سزا کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، نتیجتاً والدین کے غصہ میں اضافہ ہوتا ہے، وہ مزید جذباتی ہوجاتے ہیں اور مزید سزا دینا چاہتے ہیں، لیکن پھر اس سزا سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اِلّا یہ کہ وہ بہت سخت ہو، اس طرح یہ سزا مثبت سے زیادہ منفی اثرات پر منتج ہوتی ہے۔

پھر ہم دیکھیں گے کہ سزا کی کثرت کے سبب اس بچے کے اندر کمزوری آئے گی اور وہ اندر ہی اندر گھٹے گا، اور اس کے اندر یہ احساس پیدا ہوگا کہ اس کو اپنی خواہش اور شخصی ارادے کے اختیار کا کوئی حق نہیں ہے۔

سزا کے باب میں یہ اہم ہے کہ آپ کا بچے اور سزا کے سلسلہ میں موقف کیا ہے، سزا بذات خود مقصود نہیں ہے، چنانچہ آپ پختہ ارادے کے ساتھ صرف اگر بچے کو کمرے کے ایک کونے میں بٹھا دیں تو یہ کسی سخت سزا سے بدرجہا بہتر ہے، شرط یہ ہے کہ ایسا کرنے میں کسی طرح کا تردّد نہ ظاہر ہو، یاد رکھیئے کہ جب آپ سزا کا سہارا لیتے ہیں تو اس سے اس مسئلہ میں آپ کی ناکامی ظاہر ہوتی ہے جو سزا سے پہلے ہونا چاہیے تھا، سزا سے پہلے یہ ہونا چاہیے تھا کہ آپ بچے کے سامنے اس کی وضاحت کرتے کہ صحیح اور غلط کیا ہے اور کس چیز کا التزام کرنا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ جس گھر میں باہمی محبت و احترام اور تعاون کا ماحول ہوتا ہے اس گھر کے ماحول میں بچہ بہت کچھ سیکھتا ہے، اس ماحول میں اہل خانہ بچے کے لیے بہترین عملی نمونہ ثابت ہوتے ہیں، اہل خانہ کے پاس اس ماحول میں بچوں کے ساتھ بیٹھنے کے لیے بہت وقت ہوتا ہے، جس میں وہ بچوں کو زندگی اور سلوک و برتاؤ سے متعلق امور وضاحت سے سمجھاتے ہیں، اس ماحول میں تربیت و نصیحت اور رعایت کے لیے استقامت حاصل ہوتی ہے، یہ ماحول بذات خود حکمت آمیز، دانشمندانہ اور اچھے سلوک اور اس کے حقیقت پسندانہ اسباب کو سمجھنے میں بچے کی مدد کرتا ہے۔

سزا کے سلسلہ میں ان نکات کا لحاظ کیجئے:

۱- ڈرانے دھمکانے سے اجتناب کیجئے، ایسی چیزوں سے بچے کو مت ڈرایئے جن کے بارے میں پہلے سے آپ نے سوچا نہیں ہے اور جن کو آپ نافذ نہ کرسکیں گے، ورنہ پھر آپ کی دھمکیاں بے اثر ہوجائیں گی اور بچے کے اندر یہ احساس پیدا ہوگا کہ آپ صرف ڈراتے دھمکاتے ہیں، کر کچھ نہیں سکتے، اس لیے اولاً خود دھمکی کم ہی دیجئے، جب دیجئے تو حکمت کے ساتھ دیجئے اور جو کہیے اسے پورا کیجئے۔

۲- بچے کو آپ یہ کہہ کر سزا نہ دیجئے کہ ''میں تمہیں نہیں چاہتا، تم سے پیار نہیں کرتا''، آپ اس سے یہ نہ کہیے کہ ''آج تم نے جو حرکت کی ہے اس کے سبب آج کے بعد میں تم سے پیار نہیں کروں گا''، اس لیے کہ اس کا اس پر بڑا منفی اثر پڑے گا کیونکہ امن واعتماد

اور زندگی سے متعلق اس کا شعور اس احساس پر قائم ہے کہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں، دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اس سے آپ کی محبت کو منقطع کر سکے، اس لیے ضروری ہے کہ بچے کو یہ احساس ہو کہ کچھ بھی ہو جائے مگر آپ ہر حال میں اس سے محبت کریں گے، اس کو احساس دلائیے کہ ''میں ہمیشہ تم سے پیار کروں گا، کوئی چیز میرے اندر سے تمہاری محبت نہیں نکال سکتی''۔

۳- آپ اس کو اس طرح بھی سزا نہ دیجئے کہ معاملہ ختم ہو جائے پھر بھی اس کے ساتھ سرد مہری سے پیش آئیں، بلکہ کوشش یہ کیجئے کہ جتنی جلد ممکن ہو اتنی جلد حالات پہلے کی طرح ہو جائیں، سزا پوری ہونے اور معاملہ ختم ہونے کے بعد اگر وہ روئے تو اسے سینے سے لگائیے اور اس کا تاثر کم کیجئے، بلاشبہ آپ حقیقی اور بناوٹی آنسوؤں میں فرق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی توجہ اور شفقت حاصل کرنے کے لیے بچہ مصنوعی طور پر روئے، اگر آپ کو لگتا ہے کہ وہ بناوٹ کر رہا ہے تو آپ کچھ دیر کے لیے تجاہل برت سکتے ہیں۔

لیکن معاملہ ختم ہونے کے بعد بھی والدین کا لمبی مدت تک خاموش رہنا اور گرمجوشی سے اعراض کرنا اور بچے سے صرف نظر کرنا نقصان دہ طریقہ ہے، اس سے بچے کے اندر اضطراب پیدا ہوتا اور وہ بہت زیادہ پریشان ہوتا ہے، پھر اس سے بچے کے اندر بھی یہی بات پیدا ہوتی ہے کہ وہ والدین کو نظر انداز کرے اور ان سے ملنے میں گرم جوشی نہ دکھائے، اگر آپ بڑے ہو کر بات نہیں ختم کر سکتے اور بچے کو دوبارہ پہلے کی طرح دل کے قریب کرنے میں توقف کرتے ہیں تو کیا آپ کو چھوٹے بچے سے اس کے برخلاف امید ہے کہ وہ ایسا کرے گا؟

۴- ہمہ وقت نصیحت اور مسلسل نقد کرنے سے گریز کیجئے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر بات بار بار کہی جائے اور کسی شخص کو بار بار نصیحت وتنقید کی جائے تو بالآخر وہ سیکھ ہی لیتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ اس کو کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس امر کو یقینی بنانے والی کوئی چیز نہیں ہے کہ جو دس بار کہنے سے نہیں مانتا کیا ضروری ہے کہ سو بار سمجھانے سے سمجھ ہی لے گا، بلکہ غالب گمان یہ ہے کہ اگر بچے نے شعوری یا لاشعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ آپ کی نہیں سنے گا اور نہ مانے گا، تو بار بار نصیحت وروک ٹوک سے اس کے اندر مزید سرکشی پیدا ہوگی اور وہ کام نہ کرنے کا اس کا ارادہ پختہ تر ہوتا جائے گا، اس لیے جب آپ یہ محسوس کریں کہ وہ آپ کی نصیحت پر آپ کے کئی بار کہنے پر بھی توجہ نہیں دے رہا ہے تو آپ توجیہ و رہنمائی کا اسلوب تبدیل کرنے کے بارے میں سوچیے اور دوسرا طریقہ وحربہ (Tactics) استعمال کیجئے، یہ پتہ لگانے کی کوشش کیجئے کہ وہ آخر کیوں آپ کی بات ماننے اور رہنمائی قبول کرنے پر آمادہ نہیں:

- کیا آپ اس سے اس کے بس سے باہر کسی چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں؟
- کہیں آپ اس سے کوئی ایسا مطالبہ تو نہیں کر رہے ہیں جو اس کی عمر یا اس کی قدرت سے پرے ہو؟
- کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنے سامنے جس طرح اور بچوں کو کرتے دیکھتا ہے ویسے ہی کرنا چاہتا ہے؟
- کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ اپنی رہنمائی کے اسلوب میں سنجیدہ نہ ہوں؟
- کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ اس سے جو چاہتے ہوں وہ اس کو سمجھ ہی نہ رہا ہو؟
- کہیں ایسا تو نہیں کہ والد اس سے جو مطالبہ کر رہے ہیں والدہ اس کے خلاف کچھ اور مطالبہ کر رہی ہوں؟
- کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے اس سے جو کرنے کا مطالبہ کیا، اس کی دادی نے مداخلت کر کے اس کو اس مطالبہ کو پورا کرنے سے معافی دے دی ہو؟
- یہ بھی ایک سوال ہے کہ آپ اس سے جس کام کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ اس کے فوائد ومنافع سے واقف ہے یا نہیں؟

آپ یہ اور ایسے دیگر احتمالات پر غور کرنے کی کوشش کیجئے، عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ آپ منفی امور پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور مثبت پر کم، چنانچہ جو کام بچے کو کرنا چاہیے اس پر توجہ نہ مرکوز کر کے آپ کی توجہ ان امور پر زیادہ ہوتی ہے جن سے اس کو باز رہنا چاہیے، بچے سے عام طور پر جب کسی کام کے کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ قبول کرتا ہے بالمقابل اس کے کہ اس سے باز رہنے کا مطالبہ کیا جائے، مثلاً اس سے کہا جائے: ''اطمینان سے کھیلو'' بجائے اس کے کہ آپ اس سے یہ کہیں ''کھیل کے دوران شور نہ کرو''، ''جلدی سے آجاؤ''

بجائے اس کے کہ ''اس طرح آہستہ آہستہ نہ چلو''۔

۵- بچے کو اپنے رفیق حیات سے سزا دلوانے کی دھمکی نہ دیجئے، جیسے ماں یہ کہے آنے دو شام کو تمہارے والد کو پھر وہ تمہیں بتائیں گے، یا باپ کہے چلو ابھی تمہاری ماں سے کہتے ہیں پھر وہ تم کو بتائیں گی، اس سے بچے کے اندر تنفر پیدا ہوگا، پھر اس کو والد کے لوٹنے کا اشتیاق نہیں ہوگا، ساتھ ہی یہ ہوگا کہ بچے کے جس عمل کو والد نے دیکھا نہیں اس پر وہ ناراض ہوں گے، چونکہ انھوں نے اس کو یہ حرکت کرتے دیکھا نہیں اور وہ اس کی تفصیلات سے آگاہ نہیں اس لیے ان کو سزا دینے میں بھی تردّد ہوگا، اگر والد دن بھر کے کام کاج سے بہت زیادہ تھکے ہوں گے تو بچے کو سزا دینے میں ان کے تمام منفی احساسات شامل ہوجائیں گے یا پھر شدید تناؤ اور تھکن کے سبب بچے کو یوں ہی چھوڑ دیں گے اور کچھ نہیں کہیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم نے اس کو وہ دھمکی دی جس کو پورا نہیں کر سکے۔

۶- سزا کو مؤخر نہ کیجئے، مثلاً ''ذرا انتظار کرو میں گھر واپس آ کر تمہیں سزا دیتا ہوں''، پھر بچے کو جب تک آپ سزا نہیں دیں گے وہ یہ سوچے گا کہ آپ طویل مدت تک اپنے غصہ اور ناراضگی کو دبا کر رکھ سکتے ہیں، اگر بچے نے لائق سزا کوئی کام کیا ہے تو اس پر اس کی سزا مؤخر کرنے سے فائدہ نہ ہوگا، کیوں کہ تاخیر کر کے سزا دینے میں کچھ خاص اثر نہیں ہوتا، تجربات سے پتہ چلتا ہے کہ سزا یا معاوضہ عمل کے فوراً بعد ہی پُر اثر ہوتا ہے، جس قدر اس میں تاخیر ہوتی ہے اسی قدر اثر کم ہوتا جاتا ہے، چنانچہ جب سزا ضروری ہو تو پھر عمل کے فوراً بعد سزا دینی چاہیے، تاکہ بچہ اس برتاؤ اور اس کے اسباب کو بھی یاد رکھے اور اس سزا سے وہ سبق سیکھ سکے۔

۷- بچے کو اس طرح سزا مت دیجئے کہ سزا اس کے لیے خوفناک عمل بن جائے، سزا کے وقت کچھ خوف تو فطری بات ہے، مگر بذات خود خوف سزا کا عنصر ہو یہ پسندیدہ شے نہیں ہے، اگر سزا کے وقت بچے پر خوف کے آثار نمایاں ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سزا بہت سخت تھی، اس طرح کی بات کہنے سے بھی گریز کیجئے مثلاً ''اچھا تم کہنا نہیں سن رہے ہو ابھی فلاں آئے گا اور تم کو اٹھا لے جائے گا''، ایسے ڈراونے خواب اور قصے بھی اس کو سنا کر نہ ڈرائیے جو خود ہم بڑوں کے لیے بھی پریشان کن ہوتے ہیں۔

۸- آپ کی آواز میں ایسا رعب ہونا چاہیے جس سے بڑے ہونے اور بلند مقام پر ہونے کا اظہار ہو، مگر آواز بہت بلند اور چیخنے جیسی نہ ہونی چاہیے، کامیاب والدین و اساتذہ کی بچوں کی تربیت و تنظیم سے متعلق خصوصیات میں ایک اہم خصوصیت آواز کا صحیح استعمال کرنا ہے، ایک کامیاب استاد پُر اعتماد لہجہ میں جب رعب دار آواز نکالتا ہے تو اس آواز سے ہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ بچے سے نافرمانی کی توقع ہی نہیں رکھتا، اس کی آواز سے ظاہر ہو رہا ہے کہ بچے کو سننا ہے، ماننا ہے اور کام پورا کر کے دینا ہے، ظاہر ہے کہ اس آواز میں چیخ پکار بھی نہیں کی گئی اور نہ زور زور سے چلایا گیا، جو والدین ہمہ وقت چیختے رہتے ہیں ان کو سوائے اس کے کچھ نہیں حاصل ہوتا کہ ان کے بچے بھی چیختے رہتے ہیں، بلاشبہ پرسکون انداز میں رعب دار آواز کے ذریعہ آپ جس پختہ قوت ارادی اور تسلط کا اظہار کر سکتے ہیں وہ چیخنے اور چلانے سے نہیں ہوتا، کیونکہ چیخنے اور چلانے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا تسلط و اختیار خود آپ پر بھی بہت کمزور ہے، جب خود پر قابو نہیں تو دوسروں کے رویّے اور برتاؤ پر بدرجۂ اولیٰ آپ کو اختیار نہیں۔

۹- حتی الامکان پرسکون رہیے اور اپنے سکون کو باقی رکھنے کی کوشش کیجئے، عام طور پر شدت جذبات اور غصہ کی حالت میں آواز بہت بلند ہوجاتی ہے، غصہ کے نقصانات تو مسلّم ہیں، غصہ کی حالت میں ہم بہت سے ایسے کام کر ڈالتے ہیں جو عام طور پر نارمل حالات میں نہیں کرتے، بلکہ ان کے کرنے کا تصور بھی نہیں کرتے، ان چیزوں سے بھی بچنے کی کوشش کیجئے جن سے عام طور پر انسان کے غصہ میں اضافہ ہوتا ہے، بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو جمع ہوتی رہتی ہیں پھر اچانک آدمی کو پھٹ پڑنے پر آمادہ کر دیتی ہیں، یاد رکھنا چاہیے کہ پرسکون انداز زیادہ مؤثر ہوتا ہے، اس میں اس کا زیادہ امکان رہتا ہے کہ آدمی کوئی ایسا کام نہ کرے جس پر اس کو بعد میں شرمندگی اٹھانا پڑے۔

بہت سے والدین اس طرح کے اعتراضات کرتے ہیں، مثلاً بعض کہتے ہیں: ''میں نے قطعاً اس قوت سے اس کو مارنے کا ارادہ نہیں کیا تھا''، ''میرا قطعی اس سے یہ کہنے کا ارادہ نہیں تھا''، پھر کہتے ہیں ''لیکن چونکہ میں غصہ سے مغلوب تھا جس کی وجہ سے ایسا

ہوا''، مشکل یہ ہے کہ انسان جو کر گذرا یا جو کہہ دیا اس کو واپس نہیں لا سکتا، لیکن اب جو ہونا تھا وہ ہوا، اب آپ اپنے بچے سے معذرت کرنے میں بالکل تردّد نہ کیجئے، اس لیے کہ معذرت طلب کرنا قوت کی دلیل ہے نہ کہ ضعف کی جیسا کہ بعض لوگ تصور کرتے ہیں۔

''بیٹا معاف کیجئے: درحقیقت میں آپ کو یہ نہیں کہنا چاہتا تھا اور مجھے یہ کہنا بھی نہیں چاہیے تھا، مگر دراصل مجھے غصہ بہت شدید آ رہا تھا''، اس سے آپ کا بچہ یہ سیکھے گا کہ آپ بھی ایک انسان ہی ہیں، اس کو سمجھ میں آئے گا کہ تنہا اسی سے اس کا مطالبہ نہیں ہے کہ وہ نفس پر قابو رکھے اور اپنے برتاؤ میں فرمانبردار رہے اور خطا کا اعتراف کرے، آپ کے یہ بتانے سے کہ آپ غصہ میں تھے اس کو آپ کو سمجھنے اور آپ سے واقف ہونے میں مدد ملے گی، اس کے سامنے دل کی بات کہنے اور بات واضح کرنے کے فوائد سامنے آئیں گے جس سے اس کو اپنے احساسات و اعمال سے متعلق گفتگو کرنے کا حوصلہ ملے گا۔

۱۰- اپنے بچے کو گناہ وقصور کا احساس دلانے میں بہت شدت نہ برتیے، اس لیے کہ انسان احساسِ گناہ کو بہت زیادہ نہیں برداشت کرسکتا، اگر ہم گناہ کا احساس کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم میں کمی ہے، ہم کو جیسا ہونا چاہیے ہم ویسے نہیں ہیں، لیکن ہم بڑے یہ سوچ کر قصور و گناہ کے احساس کے ساتھ جی لیتے ہیں کہ دنیا میں کوئی بھی انسان کامل نہیں ہے، اسی لیے ہم ممکن کوشش پر اکتفا کرتے ہیں لیکن بچہ چونکہ یہ نہیں جانتا کہ اس سے ہم جس کام کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ اس کی استطاعت میں ہے یا بس سے باہر ہے، چنانچہ جب ہم اس کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ ہم اس سے ''کمال'' کے خواہاں ہیں، تو وہ سمجھتا ہے کہ ''کمال'' ممکن ہے البتہ نقص وعیب تو مجھ میں ہے اسی لیے میں کمال کے حصول میں ناکام ہوں، اگر بار بار یہی احساس ہو تو پھر اس میں نقص کا احساس گہرا ہو جاتا ہے اور خود اعتمادی بہت کمزور ہو جاتی ہے، زندگی اور امکانات کو مثبت انداز سے دیکھنے کی اس کی صلاحیت کمزور پڑ جاتی ہے، پھر اس کے اندر اپنی قوت اور اپنی کمزوری کے پہلوؤں کو جاننے کی صلاحیت بھی کمزور ہو جاتی ہے، اس طرح وہ کچھ اس طرح کے سلوک و برتاؤ کا عادی ہو جاتا ہے جس میں اسے گناہ وقصور سے بچنے کا احساس دامن گیر رہتا ہے اور آزادی و شخصی اختیار کے فقدان کا شکار رہتا ہے۔

بہت سے بچے اور نوعمر لڑکے ایسے ہوتے ہیں جن کو ان کے گھر والے بہت زیادہ گناہ کا احساس دلاتے ہیں اور بہت زیادہ ملامت کرتے ہیں، چنانچہ بعض بچے بتاتے ہیں کہ: ''جیسے ہی میں گھر میں قدم رکھتا ہوں بس میری ماں مجھے قصور و گناہ کا احساس دلانے لگتی ہیں''، اور بعض کہتے ہیں ''کہ جیسے ہی میں اپنے والد کو دیکھتا ہوں مجھے اپنی حقارت کا احساس ہونے لگتا ہے اور میں اپنا قصور و عجز محسوس کرنے لگتا ہوں''، ان منفی جذبات سے بھرے ہونے کے سبب ان بچوں کے لیے اپنے والدین سے محبت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، جس کے سبب ان کا احساسِ گناہ مزید بڑھ جاتا ہے۔

کوشش کیجئے کہ آپ بچے کو یہ سمجھا سکیں کہ اس کے طریقہ کار میں غلطی کہاں پر تھی، یہ بھی بتائیے کہ آپ اس سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ غلطیوں سے پاک اور بالکل کامل و مکمل ہو، ہم خود بھی خطاؤں سے مبرا نہیں ہیں، انسان سے غلطی تو ہوتی ہی ہے، "کل ابن آدم خطاء"، انسانی زندگی میں خطا ایک فطری چیز ہے، خطا ہمیں زندگی سے متعلق بہت کچھ سکھاتی ہے، خود مستقبل میں غلطی نہ کرنے کا سلیقہ سکھاتی ہے، یہ تو اسلام کی تعلیم ہے کہ بہترین خطا کار وہ ہیں جو خطا کے بعد توبہ کرلیں "خیر الخطائین التوابون"۔

۱۱- بچے کا دوسروں کے ساتھ تقابل مت کیجئے، مثلاً اس سے یوں نہ کہیے:

''پڑوسی کے بچے عدنان کو دیکھو، ہمیشہ اس کی ماں جو کہتی ہے وہ مانتا ہے''۔ ''مصطفیٰ کو دیکھو، وہ تم سے چھوٹا ہے مگر پڑھنے میں تم سے اچھا ہے''۔ ''سعید کو دیکھو وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا''۔

بعض لوگ اس طرح کی عبارتوں سے اپنے بچوں کے سامنے مثالی صورت پیش کرتے ہیں، اس طرح وہ اپنے بچوں کا دوسروں کے ساتھ تقابل کرتے ہیں جو انتہائی غیر واقعی عمل ہے، بلکہ یہ بچے کے حق میں ظلم ہوتا ہے، آپ کا بچہ مستقل ایک انسان ہے، اس کی اپنی شخصیت اور ذاتی خصوصیات ہیں، اس کو آپ کے تعاون کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو قبول کرسکے اور اپنی خاص صفات و خصوصیت میں اضافہ کرسکے۔

۱۲- آپ اپنے بچے کو جو سزا دے رہے ہیں اس کی تاثیر کے بارے میں غور کریئے کیونکہ بسا اوقات بہت سی سزائیں بچے کے سلوک وعمل کی تصحیح کے بجائے اس کو مزید خراب کرنے کا سبب بنتی ہیں، مثلاً بچہ روڈ پر جہاں گاڑیاں چل رہی ہیں وہاں اچانک دوڑ کر سڑک پار کرنے لگا، ماں فوراً چیخنے لگی اور اس کو منع کرنے لگی تاکہ وہ کسی حادثہ کا شکار نہ ہو، بچہ ماں کی بات پر کان دھرتے ہوئے جیسے ہی رکا ماں نے اس کے گال پر ایک طمانچہ رسید کر دیا'' تاکہ اس کو بتا سکے کہ سڑک پار کرنا ایک اہم اور خطرناک عمل ہے''، یہاں ماں نے اپنے غصہ، خوف اور جذبات کے سبب ایسا کیا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس طمانچہ کا بچے کے عمل پر کیا اثر پڑا، اس نے الٹا یہ سیکھ لیا کہ آئندہ ماں کی بات نہیں سننا، بالخصوص جب وہ غصہ میں آواز دے تو بالکل بھی نہیں سننا ورنہ پھر طمانچہ کھانا پڑے گا، ایسے موقع پر بہتر تو یہ تھا اور ہونا یہ چاہیے تھا کہ ماں بچے کو سینے سے چمٹا لیتی کیونکہ اس نے اس کی بات مان لی تھی اور اس کے بلانے پر واپس آ گیا تھا، پھر وہ سڑک پار کرنے کی اہمیت، خطرناکی اور طریقے کو اس کے سامنے واضح کرتی، اس طرح وہ زیادہ بہتر طریقے سے سبق حاصل کرتا۔

بہت سے والدین کہتے ہیں کہ وہ جتنی بھی کوشش کر لیں مگر ان کا بچہ ان کی بات نہیں سنتا اور دھیان نہیں دیتا، یہ والدین اگر ذرا بھی غور کریں تو ان کو سمجھ میں آ جائے گا کہ انھوں نے دراصل توجہ نہیں دی کہ بچے کو جب جب سزا ملی تب تب اس نے آئندہ سزا سے بچنے کے نئے طریقے تلاش لیے، اسی وجہ سے وہ اب نہ والدین کی بات مانتا ہے اور نہ اطاعت کرتا ہے، کیونکہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، کبھی جھوٹ سے کام چلاتا ہے، پھر جب حقیقت سامنے آتی ہے تو والدین کو اور زیادہ غصہ آتا ہے، وہ اس کو متہم کرتے کہ وہ کھلواڑ کر رہا ہے، بہانے بنا رہا ہے اور جھوٹ بول رہا ہے، حالانکہ اس نے جو کچھ بھی کیا محض سزا اور تکلیف سے بچنے کے لئے اپنی ذہانت کا استعمال کیا، یہ عمل صرف بچے ہی نہیں کرتے، ہم بڑے بھی ہمیشہ کسی بھی طرح کی تکلیف وعقاب سے بچنے کے لیے اس طرح کے حیلے اختیار کرتے ہیں۔

چنانچہ بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ سزا سے بچنے کے لیے حتی الامکان جرم سے انکار کی کوشش کرتا ہے، خواہ اس کے لیے اسے جھوٹ بولنا پڑے، چھپانا پڑے یا کچھ بھی کرنا پڑے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ انجام کار پٹائی ہے، خواہ وہ جرم کو چھپا لے یا اعتراف کر لے یا جھوٹ بولے یا ماں کی بات مان لے مگر بالآخر اس کو مار ہی کھانا ہے، ہم یہاں یہی بات سمجھانا چاہتے ہیں کہ آپ جو سزا دے رہے ہیں اس سے بچے کے سلوک وعمل پر پڑنے والی تاثیر کے بارے میں غور کیجئے، اگر آپ دیکھتے ہیں کہ وہ آپ سے چیزیں چھپاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے اس کے اعتراف کے باوجود اس کو سزا دی جبکہ اس کے سچ بولنے اور شجاعت کے سبب آپ کو اسے بطور انعام کچھ دینا چاہیے تھا، اگر وہ آپ کے بلانے پر آپ کے پاس آنے سے انکار کرتا ہے، تو مطلب صاف ہے کہ پہلے کبھی وہ آپ کے بلانے پر آیا اور آپ نے اس کو سزا دی، یا ایسا کچھ کیا جو اس کو پسند نہ آیا خواہ آپ نے اس کو سونے کے لیے ہی بھیج دیا ہو، گویا بچے نے یہ سب ان ہی تجربات سے سیکھا جو اس کو اپنے سلوک اور والدین کے ردّعمل کے باہمی ربط سے حاصل ہوئے، اس نے آپ کے بلانے پر آنے اور پھر مار کھانے کو جوڑ کر دیکھا اور پھر جو نتیجہ نکلا اسے آئندہ استعمال کیا، اس تجربہ کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ جب آپ بلائیں گے تو وہ آپ کی بات سننے سے گریز کرے گا یا پھر کم از کم اس جوش کے ساتھ تو بات قبول نہیں کرے گا جو ہونا چاہیے تھا، اس لیے آپ اس کے ساتھ مثبت رویّہ اپنائیے، اگر وہ بات مانتا ہے، اعتراف خطا کرتا ہے، سچ بولتا ہے تو سزا اور منفی نتیجہ سے دوچار کرنے کے بجائے ایجابی امور پر توجہ دیجئے تاکہ صدق واعتراف اور انعام و اچھے معاوضہ کے درمیان ربط دیکھ کر اس کے اندر ایجابی فکر پیدا ہو، ہمیشہ قول الٰہی کے پیش نظر رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے إن اللہ یحب التوابین (بقرہ ۲۲۲)، اگر آپ ایسا مثبت رویہ اپنائیں گے تو گویا آپ اپنے اس عمل سے اس کو بار بار اچھے کام کرنے اور اپنی بات سننے اور ماننے پر حوصلہ افزائی کریں گے، اور اگر پھر بھی اس سے کوئی منفی عمل سرزد ہو تو بغیر کسی سزا اور ذہنی خلجان کے صرف پُرسکون انداز میں سنجیدگی کے ساتھ اس سے گفتگو کافی ہوگی۔

☆☆☆

❑ شخصیات

استادِ گرامی پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی مرحوم

کچھ یادگار لمحات و تاثرات

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

اللہ رب العزت نے اولین دو انسانوں کو زمین میں بھیجتے ہوئے جو پیغام(ولکم فی الارض مستقرّ و متاع الیٰ حین ؍البقرۃ:۲/۳۶)[اور تم سب کے لیے زمین میں ٹھکانا اور(یہاں کا) ساز و سامان ایک (مقرر) مدت تک کے لیے ہے] دیا تھا، اس کی حقانیت و معنویت کے مظاہر آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں، اس کا ایک حالیہ ظہور ۱۵/ستمبر ۲۰۲۰ء کو استادِ گرامی پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کے دارِ فانی سے ہمیشہ ہمیش کے لیے رخصت ہو جانے کی صورت میں ہوا۔اِنّا للہ واِنّا الیہِ راجعون۔

استاد گرامی ایک مثالی معلم اور مایۂ ناز محقق و مصنف تھے۔ان کی نگارشاتِ عالیہ مختلف رسائل و مجلّات کی زینت بنتی تھیں۔سہ ماہی ''تحقیقاتِ اسلامی'' (علی گڑھ) کا امتیاز ہے کہ ایک مضمون نگار یا قلمی معاون کی حیثیت سے اس مجلّہ سے ممتاز اسکالر، معروف سیرت نگار اور نامور محقق و مصنف پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی مرحوم کا تعلق اس کے اولین شمارے سے قائم ہوا، تو زندگی کے آخری ایام تک برقرار رہا۔''تحقیقات اسلامی'' کے پہلے شمارہ (جنوری ۱۹۸۲ء) میں ان کا مضمون ''تاریخِ اسلام میں فنِّ شانِ نزول کی اہمیت'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ مضمون کی صورت میں ان کی زندگی کی آخری علمی یادگار (جنت میں داخلہ کی قرآنی ضمانتیں اور حدیثی تشریحات) اسی مجلّہ کے شمارہ (۳/۳۹، جولائی۔ستمبر ۲۰۲۰ء) کی زینت بنی۔اس طرح مجلّہ تحقیقاتِ اسلامی سے ان کا قلمی ربط و تعاون تقریباً ۳۹ برس جاری رہا۔ استادِ محترم ماہنامہ ''معارف'' کے بھی مستقل قلمی معاونین میں سے تھے۔اس میں ان کا پہلا مضمون بعنوان ''بنو عبد مناف۔عظیم تر متحدہ خاندانِ رسالت'' فروری ۱۹۹۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور آخری مضمون جون ۲۰۲۰ء کے شمارہ میں ''شبلی خطوطِ ماجدی میں'' کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوا۔ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ میں بھی مرحوم کے متعدد مضامین شائع ہوئے۔ان کا مقالہ (صدر اول میں تفسیرِ قرآن کے مصادر) اس کے دوسرے شمارے (۱/۲، جنوری۔جون ۱۹۸۶ء، ص۵۶۔۸۷) میں شائع ہوا تھا اور اس مجلّہ میں شائع ہونے والا ان کا آخری مقالہ (غلبۂ مسلم کا قرآنی نسخہ) ''عصرِ حاضر کے مسائل اور قرآنی تعلیمات'' سیمینار مقالات پر مشتمل خصوصی اشاعت (۲/۲۲۔۱/۲۴ ، جولائی ۲۰۰۷ء۔جون ۲۰۰۹ء، ص۳۰۲۔۳۲۰) کی زینت بنا تھا۔

استادِ مکرم کا '' تحقیقاتِ اسلامی ''میں شائع ہونے والا آخری مضمون پہلے رسالہ کی ای۔میل فائل میں نظر سے

گذرا تو اس کا عنوان دیکھ کر دل میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی اور یہ خواہش ہوئی کہ کاش مجھے اپنے استادِ گرامی کی خدمت میں یہ شمارہ پیش کرنے کا موقع نصیب ہوجائے۔اس سے پانچ چھ روز قبل (۲۴/اگست کو) میں استادِ مکرم کی ملاقات وعیادت کے لئے ان کے گھر پر حاضر ہو چکا تھا، بیماری کی خبر ملنے کے بعد یہ میری پہلی ملاقات تھی۔اس ملاقات کے وقت میں ماہنامہ معارف کے شمارے (اپریل تا اگست ۲۰۲۰ء) لے کر حاضر ہوا تھا جو اعظم گڑھ سے دستی موصول ہوئے تھے اور ان میں جون کا شمارہ بھی تھا جس میں استادِ گرامی کا مضمون شریکِ اشاعت تھا۔ سچ پوچھئے تو اسی شمارہ کی نسبت سے حاضری سے قبل فون پر گفتگو ومزاج پرسی پر مجھے ان کی بیماری کی خبر ملی تھی۔اس ملاقات میں دس پندرہ منٹ ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے اپنے ہم درس و رفیقِ مکرم پروفیسر اشتیاق احمد ظلّی صاحب کی خیریت بھی معلوم کی، نقاہت طاری تھی، اٹھنے لگے تو سہارا دینے کی ضرورت ہوئی۔ بہر حال دوبارہ جلد ملاقات کرنے اور ''تحقیقاتِ اسلامی'' کے مذکورہ شمارے کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضری کی طلب تھی، اللہ کا کرم کہ اس کی راہیں ہموار ہوگئیں، کچھ احباب کے تعاون سے چند دنوں بعد مجھے اس شمارے کی کاپی موصول ہوگئی۔ مضمون کا عنوان جاذبِ نظر تھا ہی، اس کا موضوع بھی دل کو بھا گیا، اسے پڑھ کر دوسرے روز (یکم ستمبر کو) اس ارادہ کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوا کہ اس مضمون سے متعلق اپنے احساسات استادِ گرامی کے سامنے پیش کروں گا۔ ملاقات ہونے پر صورتِ حال دیکھی تو ارادہ ملتوی کر دینا پڑا، کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی، یہ بتاتے ہوئے تحقیقاتِ اسلامی کا شمارہ پیش کیا کہ اس میں آپ کا مقالہ شریکِ اشاعت ہے۔ یہ محسوس کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ اس اہم شمارہ کی کاپی مجھے خود استاد گرامی کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوگئی۔ کچھ دیر رک کر پرسشِ احوال کیا اور اس دعاء کے ساتھ واپسی ہوئی کہ اللہ کرے استادِ مکرم کی طبیعت بہتر ہوجائے اور انہیں شفاء نصیب ہو۔ وقفہ وقفہ سے ان کے صاحب زادوں سے خیریت معلوم کرتا رہا اور پھر ۱۲/ستمبر کو حاضرِ خدمت ہوا تو حالت اور غیر نظر آئی، کمزوری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی، بار بار کھانسی آنے کی وجہ سے کچھ بات کرنا بھی مشکل تھا۔بس اتنا کہا کہ دعاء کرو، خاص طور سے نیند کے لئے، کل کی رات بے خوابی میں گذری۔''الامین'' (مسکنِ استادِ مکرم) سے رخصت ہوتے وقت یہ شان وگمان میں بھی نہ تھا کہ مشفق استاد سے یہ ملاقات آخری ملاقات بن جائے گی اور چند دنوں بعد ربِّ کریم کے بلاوے پر وہ دارِ فانی سے رخصت ہوجائیں گے۔ محولہ بالا مضمون پر کچھ احساسات کا اظہار کیا؟ دوبارہ ملاقات کی حسرت بھی حسرت ہی رہ گئی اور اس آیتِ کریمہ کا ایک اور مصداق سامنے آگیا: لن یوخّر اللہ نفساً اذا جاء اجلھا واللہ خبیر بما تعملون (المنٰفقون:۶۳/۱۱)۔

ایک استاد کی حیثیت سے بھی سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی مرحوم کی شخصیت مثالی رہی ہے۔انہوں نے پہلے شعبہ تاریخ اور بعد میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں تدریسی خدمات انجام دیں۔شعبۂ تاریخ میں وہ میرے استاد رہے ہیں۔ وہ ایک مشفق استاد ہونے کے ساتھ ساتھ مخلص مربّی بھی تھے۔ برادرِ مکرم مولانا عمیر الصدیق ندوی نے ''معارف'' (اکتوبر ۲۰۲۰ء) میں ''وفیات'' کے تحت مرحوم پر تعزیتی تحریر میں ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے والدِ محترم کا نام ہمیشہ ''اصل معلم ومربی'' کی حیثیت سے لیتے رہے (ص ۳۱۴)۔ سچ یہ کہ مجھ جیسے ان کے بہت سے رسمی وغیر رسمی شاگردوں کا یہ احساس ہے کہ لائق وسعادت مند فرزند نے اپنے ابّا جان سے سبق حاصل کرتے ہوئے یہ وصف اپنے اندر رچا بسا لیا تھا۔ درس و تدریس اور دیگر علمی کاموں میں

سنجیدگی وانہماک ان کا وصفِ خاص تھا، وہ نظم وضبط کے بہت پابند تھے اور طلبہ کو بھی اس کا پابند بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ استاد کی حیثیت سے ان کی ایک بہت ہی نمایاں خوبی طلبہ کی تعلیم وتربیت میں خصوصی دلچسپی تھی، انہیں ہر ممکن علمی تعاون دینے میں وہ خوشی محسوس کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں کی صلاحیتوں کو نکھارنے اور انہیں تحقیق وتصنیف کی عملی تربیت دینے میں وہ بڑی جانفشانی وفراخ دلی کا مظاہرہ کرتے اور وقت کی قربانی دیتے تھے۔ مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہوا، شعبۂ تاریخ میں ریسرچ کی مصروفیات کے دوران مضمون یا مقالہ نگاری کی تربیت انہی کی مرہونِ منت ہے۔ بلاتکلف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میدان میں مجھے قلم پکڑنا انہی نے سکھایا۔ وہ میرے رسمی سپروائزر نہیں تھے، لیکن صورتِ حال یہ تھی کہ سیمینار وکانفرنس وغیرہ کے لئے انگریزی میں مقالہ کی تیاری کے دوران مرحوم کے مکان پر حاضر ہوتا تو اس کی تصحیح وتہذیب میں خوشی خوشی گھنٹہ، دو گھنٹہ صرف کردیتے اور ذرا بھی اکتاہٹ یا ناگواری ظاہر نہ ہوتی۔ بلاشبہ اس طرح کے واقعات ایک ناچیز شاگرد کی تربیت اور اس کی ٹوٹی پھوٹی صلاحیتوں کو نکھارنے میں ایک مشفق استاد کی گہری دلچسپی کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ استادِ مکرم یکم نومبر ۱۹۸۳ء کو شعبۂ اسلامک اسٹڈیز سے ریڈر کی حیثیت سے وابستہ ہوئے، میں اکتوبر ۱۹۸۴ء کے آخر میں اِس شعبہ سے بحیثیت لکچرر منسلک ہوا۔ شکرِ الٰہی کہ ان سے استفادہ کی راہیں مزید ہموار ہوئیں۔ حقیقت یہ کہ اس شعبہ میں بھی میرے لئے ان کی حیثیت استاد ومربی کی ہی زیادہ رہی۔ تدریسی فرائض کی انجام دہی میں ان کے کلاس کے تجربات، منہجِ تدریس وانداز تربیت سے فائدہ اٹھاتا رہا اور یہاں بھی ان کی صحبتوں اور مجلسوں میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ واقعہ یہ کہ آخر وقت تک ان سے فیض یابی کا سلسلہ جاری رہا۔

درس وتدریس میں مہارت، تدریسی فرائض کی دیانت داری کے ساتھ انجام دہی اور تحقیقی وتصنیفی کاموں سے گہرا شغف، فرد واحد میں دونوں کے اجتماع کی مثالیں کم نظر آتی ہیں۔ واقعہ یہ کہ استادِ گرامی کی شخصیت اس پہلو سے بھی مثالی رہی ہے۔ استادِ مکرم کے تحقیقی ذوق کا ذکر کرتے ہوئے مرتبِ ''معارف'' مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی صاحب نے اپنی محولہ بالا تحریر میں صحیح تاثر ظاہر کیا ہے کہ ''تحقیق کا عمل جیسے ان کے خمیر میں شامل ہوگیا اور اس کا سب سے بہترین اظہار سیرتِ نبوی ﷺ کے مطالعہ اور نتائجِ مطالعہ کی شکل میں آیا''۔ بلاشبہ مرحوم نے قرآن، حدیث، سیرتِ نبوی ﷺ، اسلامی تاریخ، عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ، سوانح وشخصیات مختلف موضوعات پر اپنے مطالعہ وتحقیق اور غور وفکر کے نتائج کتب ومضامین کی صورت میں پیش کئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ تصنیف وتالیف کے میدان میں سیرتِ نبوی ﷺ ان کا خصوصی موضوع تھا اور عامی زبان میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس موضوع کو انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ ان کی تحریروں (کتب ومضامین) کا غالب حصہ، جیسا کہ بخوبی معروف ہے، سیرتِ نبوی ﷺ سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے مقالات ومضامین کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی تھا کہ اگر قرآن یا علمِ قرآن سے متعلق کسی موضوع پر اپنا مطالعہ وتحقیق پیش کررہے ہیں تو حدیث سے اس کا ربط قائم کردیتے تھے یعنی حدیثی تشریحات سے اسے مزین کردیتے تھے اور اگر حدیث یا سیرتِ نبوی ﷺ کے کسی پہلو پر دادِ تحقیق دیتے تو متعلقہ قرآنی آیات سے استشہاد کا اہتمام کرتے۔ ماہنامہ معارف، سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی اور ششماہی علوم القرآن اور دیگر رسائل ومجلّات میں شائع شدہ ان کے مقالات میں اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان کی حیات میں شائع ہونے والا ان کا آخری مضمون (جنت میں داخلہ کی قرآنی ضمانتیں اور حدیثی تشریحات) بھی اس تحریری امتیاز کا آئینہ دار ہے۔

''تحقیقاتِ اسلامی'' میں شائع شدہ استادِ محترم کا یہ آخری مضمون عنوان و موضوعِ بحث دونوں لحاظ سے نہایت اہم و لائقِ مطالعہ ہے۔ یہ مضمون اس پہلو سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ''تحقیقاتِ اسلامی'' کے شمارہ (اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۹ء) میں شائع ہونے والے ایک مضمون کے مشتملات کے محض ایک صفحہ پر اظہارِ خیال ۱۴ صفحات کے ایک مبسوط مضمون کی صورت اختیار کر گیا۔ بلا شبہ یہ استادِ گرامی کے وسعتِ مطالعہ اور تحقیقی ذوق کا آئینہ دار ہے۔ یہ مضمون بالخصوص اس پہلو سے نہایت قیمتی وقابلِ قدر ہے کہ اس میں ایسی متعدد آیات کو مع ترجمہ و تشریح جمع کر دیا گیا ہے جن میں ایمان وعمل صالح پر جنت کی بشارت دی گئی ہے یا جن میں اللہ رب العزت نے اپنے مومن بندوں کو ان کے نیک اعمال کے صلہ میں حقیقی کامیابی، اپنی رضا اور جنت نصیب کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ مضمون کے آخری حصہ میں تحقیقاتِ اسلامی کے اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۹ء کے شمارے) میں شائع شدہ مضمون (جو غالباً زیرِ مطالعہ مضمون کا محرّک بنا تھا) کے اس حصہ پر تبصرہ فرمایا ہے جس میں نیک اعمال کے بدلہ میں جنت میں داخلہ کی ضمانت سے متعلق بعض آیات (وتلك الجنّة التی اورثتموها بما کنتم تعملون /الزخرف/۷۲؛ادخلوا الجنّة بما کنتم تعملون /النحل/۳۲) اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ظاہری تعارض کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے: "لن یدخل احدکم عمله الجنّة" (کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں نہیں داخل کرائے گا)۔ حضرت عائشہؓ سے مروی اس حدیث کا پورا متن یہ ہے: عن عائشةؓ انَّ رسول الله ﷺ قال سدّدوا و قاربوا واعلموا ان لن یدخل احدکم عمله الجنّة وانَّ احبّ الاعمال ادومها الی الله وان قلَّ (صحیح بخاری، کتاب الرقاق میں باب القصد والمداومۃ علی العمل)۔

(امام بخاریؒ وامام مسلمؒ کی بعض روایتوں میں آپ ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کے بعد بعض صحابہؓ کا یہ سوال بھی منقول ہے: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ بھی نہیں؟ جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، میں بھی نہیں اِلّا یہ کہ اللہ اپنے فضل وکرم اور اپنی رحمت سے مجھے ڈھانک لے (قالوا ولا انتَ یا رسول الله؟ قال: ولا انا اِلّا ان یتغمّدنی بفضل و رحمة [صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین واحکامھم، باب لن یدخل احداً الجنّۃ احد بعملہٖ بل برحمۃ اللہ تعالیٰ])۔

صحیح بخاری کی مذکورہ حدیث کے حوالے سے بعض شارحینِ حدیث نے قرآنی آیات واحادیث میں تعارض کو اس طور پر رفع کرنے کی کوشش کی ہے کہ آیات میں ایمان و نیک اعمال کے صلہ میں جنت میں داخلہ کی جو بشارت سنائی گئی ہے اس سے مراد جنت کے منازل ومقامات ہیں، بعض آیات میں عمل کی جزا میں جنت میں داخلہ کا جو ذکر ہے وہ مجمل ہے۔ جہاں تک نفس جنت میں داخلہ کا تعلق ہے وہ اللہ کی رحمت سے ہوگا۔ استادِ گرامی نے اس تشریح وتاویل سے اختلاف کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ اعمالِ صالحہ کی جزا میں جنت میں دخول سے متعلق ''آیاتِ کریمہ بہت مفصل ہیں اور مذکورہ آیت کریمہ (النحل/۳۲) میں واضح ہے کہ جزائے اعمال کا نتیجہ داخلۂ جنت ہے'' (تحقیقاتِ اسلامی، جولائی۔ستمبر ۲۰۲۰ء ص ۶۴)۔ پھر اسی ضمن میں آگے نیک عمل اور اس کے نتیجے میں رحمتِ الٰہی سے بہرہ مند ہونے پر بعض ممتاز محدثین وشارحینِ حدیث کی بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے: ''طاعت و عمل کی توفیق بھی رحمتِ الٰہی ہے اور رحمتِ ربّانی وفضلِ الٰہی بھی اسی عمل سے ملتا ہے.....اعمالِ صالحہ کی توفیق اور اس پر عمل اور اس کی مداومت سب رحمتِ الٰہی سے ہوتی ہے، لہٰذا عملِ صالح دخول وخلودِ جنت اور اس کے منازل ومحلات و درجات کا باعث بن جاتا ہے'' (حوالۂ مذکور، ص ۶۶)۔ حقیقت یہ کہ

ایمان وعمل صالح کی جزاء میں جنت نصیب ہونے سے متعلق قرآنی آیات اتنی صریح وواضح ہیں کہ استادِ مکرم نے بجا طور پر اس تاویل سے اختلاف ظاہر کیا ہے کہ ان سے نفس دخولِ جنت مراد نہیں، بلکہ عمل کے لحاظ سے جنت کے مختلف منازل یا درجا ت میں داخلہ ہے۔ مزید براں ایمان وعملِ صالح اور رحمت الٰہی میں تعلق کی نسبت سے استادِ گرامی نے یہ وضاحت بھی فرمائی کہ ''نیک اعمال سے رحمتِ الٰہی ملتی ہے، بلکہ رحمتِ الٰہی ہی ان کی جزا ہے'' (حوالۂ مذکور، ص ٦٧)۔ استادِ محترم نے زیرِ بحث مسئلہ پر اپنی تحقیقات میں اس نکتہ پر خاص زور دیا ہے کہ قرآن مجید میں ''ایمان وعملِ صالح کو رحمتِ الٰہی کی عطا کا پروانہ کہا گیا ہے'' (حوالۂ مذکور، ص ٦٧)۔ یہ امر بدیہی ہے کہ نیک اعمال ہی اہلِ ایمان کو رحمتِ الٰہی کا مستحق بناتے ہیں، یعنی اعمالِ صالحہ کی بدولت انہیں اللہ رب العزت کی رحمت نصیب ہوتی ہے۔ آخر میں استادِ گرامی نے ایک اور اہم نکتہ کی جانب توجہ دلائی ہے کہ ''عملِ صالح کی توفیق بھی رحمتِ الٰہی ہے'' اور اس سے متعلق حضرت رابعہ بصریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ اپنے مومن وتائب بندے کو بخشنا چاہتا ہے، اس لیے وہ اسے ایمان، عمل صالح اور توبہ کی توفیق دیتا ہے'' (ص ٦٨)۔ درحقیقت یہی وہ نکتہ (ایمان، نیک عمل کی طلب واس کی انجام دہی اور توبہ کی توفیق اور دعاء کی قبولیت سب کچھ اللہ کی رحمت سے نصیب ہوتی ہے) جس کی تائید سے متعلق یہ ناچیز استادِ گرامی کے سامنے اپنے احساسات پیش کرنا چاہتا تھا، لیکن افسوس کہ اس کا موقع نہیں مل سکا اور ان کا وقتِ موعود آ گیا۔

كُلّ من عليها فان و يبقى ربُّكَ ذوالجلال والاكرام (الرحمٰن: ٢٧/٥٥)۔

جنت میں داخلہ سے متعلق قرآنی آیات کی ترجمانی و تشریح اور بعض احادیث کے بارے میں علمائے حدیث یا شارحینِ حدیث کی توضیحات کے حوالے سے استادِ مکرم کے مطالعات سے دو اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ نیک عمل کی توفیق رحمتِ الٰہی سے ہی نصیب ہوتی ہے، اور نیک عمل ہی جنت میں داخلہ کا اصل وسیلہ بنے گا، یعنی نیک عمل کی توفیق نصیب ہونے میں اللہ کی رحمت کا خاص دخل ہے، اس لحاظ سے اسے دخولِ جنت کا وسیلہ کہنا بھی صحیح ہوگا۔ دوسرے یہ کہ ایمان وعمل صالح موجبِ رحمتِ الٰہی بنتا ہے، اس لیے یہ بات بھی برحق ہے کہ ایمان وعملِ صالح کے صلہ میں جنت نصیب ہوگی، جیسا کہ پیشِ نظر مضمون میں نقل کردہ متعدد آیات سے بہت ہی واضح طور پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے۔ دراصل ایمان وعمل صالح اور رحمتِ الٰہی باہم مربوط ہیں اور بقول استادِ محترم ''رحمتِ الٰہی ایمان وعمل صالح سے مربوط ومشروط ہے اور انہی سے وہ نصیب ہوگی'' (حوالۂ مذکور، ص ٦٤۔٦٥)۔ یعنی دونوں ایک دوسرے سے منسلک ہیں، ایک کو دوسرے کا ثمرہ یا ایک کو دوسرے کا وسیلہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ نکتہ پیشِ نظر مضمون میں کئی مقام پر اجاگر کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ کہ رحمتِ الٰہی کا چشمہ ہر وقت جاری رہتا ہے، لوگوں کو سیراب کرنے کے لئے وہ ایک بہانہ ڈھونڈتی ہے (رحمتِ حق بہانہ می جوید) اور کسی کو نیک عمل کی توفیق ملنا اس کا بہانہ بن جاتا ہے اور بلاشبہ نیک عمل کی انجام دہی رحمتِ الٰہی کا خزانہ ساتھ لاتی ہے۔ قرآنی آیات (جن کے حوالے استادِ گرامی کے مضمون میں بھی ملتے ہیں) میں متعدد اعمال صالحہ کی انجام دہی پر رحمتِ الٰہی کے استحقاق کا ذکر ہے، ان میں دو آیات اپنے مضمون کے اعتبار سے بہت ہی جامع ہیں: هذا كتاب انزلنٰه مبارك فاتبعوه واتّقوا لعلكم ترحمون (الانعام: ٦/١٥٥) [یہ کتاب جسے ہم نے نازل کیا ہے، بڑی بابرکت ہے، پس اس کی پیروی کرو اور پرہیز گاری اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے]۔ واطيعو الله و الرسول لعلّكم ترحمو ن (آل عمران: ٣/١٣٢) [اور

اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے]۔ظاہر ہے کہ قرآنی ہدایات واحکام کی پیروی اور اللہ واس کے رسول کی اطاعت میں سارے نیک اعمال آ گئے جن کی انجام دہی یقینی طور پر رحمتِ الٰہی کا مستحق بناتی ہے۔اسی ضمن یہ اضافہ مناسب معلوم ہوتا کہ یہ اکثر ذکر ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت کی رحمت ہی سے ہمیں نیک عمل کی توفیق نصیب ہوتی ہے،لیکن اس کی طرف ہماری توجہ کم جاتی ہے کہ ہمارے دل میں نیک عمل کی طلب بھی درحقیقت اللہ ہی کی توفیق یا اس کی رحمت ہی سے پیدا ہوتی ہے،یا ہم نے کسی اچھے کام کا ارادہ کیا تو اس ارادہ میں بھی اللہ ہی کی توفیق شاملِ حال رہتی ہے۔یہاں اُس شعر کا نقل کرنا بہت برمحل معلوم ہوتا ہے جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک مضمون میں بہت پہلے نظر سے گزرا تھا:

مِری طلب بھی انہی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں ، اٹھائے جاتے ہیں

(راہِ اعتدال،عمرآباد[اعتدال نمبر]،۶/۲،اکتوبر ۲۰۰۵ء،ص ۳۶)

مختصر یہ کہ استادِ گرامی کی دینی وعلمی خدمات مختلف پہلوؤں سے بڑی وقیع و قابلِ قدر ہیں اور اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ سیرتِ نبویﷺ سے متعلق ان کی کتابیں و مضامین اور ان کے خطبات ولکچرس کے مجموعے ان کی علمی یادگاروں کا سب سے قیمتی حصہ ہیں۔اللہ کرے قرآن کریم اور سیرتِ نبویﷺ سے متعلق ان کا تحریری سرمایہ ان کے لئے ذخیرۂ آخرت بن جائیں۔

اوپر یہ ذکر کیا گیا کہ ان کی نگارشات میں قرآن مجید، حدیث اور سیرتِ نبویﷺ سے متعلق ان کی کتابیں ومقالات دینی وعلمی لحاظ سے سب سے زیادہ وقعت واہمیت کی حامل ہیں۔حدیث و سیرتِ نبویﷺ پر مرحوم کی اردو،عربی و انگریزی کتب کی تعداد تیس سے زائد ہیں اور ان موضوعات پر ان کے شائع شدہ مضامین سیکڑوں کی تعداد میں ہیں جو برِّصغیر اور دوسرے ملکوں کے رسائل و مجلّات میں بکھرے پڑے ہیں۔ان سب تحریریوں کو جمع کرنے اور انہیں مرتب کرنے میں کافی وقت درکار ہے اور بعض اہلِ علم اس کام میں مصروف ہو چکے ہیں ۔ فی الحال استادِ گرامی مرحوم کی قرآنی کتب اور ماہنامہ'' معارف''(اعظم گڑھ)،سہ ماہی '' تحقیقاتِ اسلامی''(علی گڑھ)،ششماہی''علوم القرآن''(علی گڑھ) اور'' نقوش'' قرآن نمبر (لاہور) میں مرحوم کے شائع شدہ قرآنی مقالات کی فہرست (مع تفصیلاتِ اشاعت) ذیل میں دی جارہی ہے۔اللہ کرے یہ فہرست'' ندائے اعتدال'' کے قارئین کرام لئے باعثِ افادیت ثابت ہو۔

۱۔ قرآنی کتب:

۔ اندلس میں علوم قراءت کا ارتقاء،ادارہ علوم اسلامیہ،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ،۱۹۹۸ء(صفحات ۲۸۴)

۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی قرآنی خدمات (سیمینار مقالات)[مرتبہ:محمد یٰسین مظہر صدیقی وظفر الاسلام]،ادارہ علومِ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ،۲۰۱۳ء(صفحات ۲۹۱)

۳۔ قرآنی مقالات:

(معارف،اعظم گڑھ)

۱۔ صحفِ صدیقی اور حضرت مروان امویؓ، معارف، ۶/۱۷۸، دسمبر ۲۰۰۶ء،ص ۴۰۵۔۴۱۴

۲۔ بسملہ آیاتِ قرآنی میں (دو قسطیں)، معارف،۳/۱۸۲،ستمبر ۲۰۰۸ء ،ص ۱۶۵۔۱۷۹؛ ۴/۱۸۲، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۱۔۲۷۴

۳۔ مولانا دریابادیؒ کی قرآنی بصیرت، معارف،۴/۱۸۳،اپریل ۲۰۰۹ء،ص ۲۴۵۔۲۶۶

(تحقیقاتِ اسلامی،علی گڑھ)

۴۔ تخلیقِ انسانی کی غرض و غایت (سورہ ہود کی دو آیات ۱۱۸۔۱۱۹) کا صحیح مفہوم، سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی ،۱۲/۱۔

جنوری۔مارچ ۱۹۹۳ء،ص ۱۳۔۴۰

۵۔ طاقت کے توازن کا قرآنی اصول (سورہ انفال کی دو آیات ر ۶۵۔۶۶) کی روشنی میں (دو قسطیں)، تحقیقاتِ اسلامی، ۱۷/۳، جولائی۔ستمبر ۱۹۹۸ء،ص ۱۷۔ ۴۷؛ ۱۷/۴، اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۹۸ء،ص ۲۱۔۴۵

۶۔ ''تدبرِ قرآن'' میں استنادِ حدیث، تحقیقاتِ اسلامی، ۲۲/۴، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۳ء،ص ۴۳۔۶۴

۷۔ مصاحفِ عثمانی کی ترتیب وتدوین۔احادیث کی روشنی میں،تحقیقاتِ اسلامی،۲۳/۱،جنوری۔مارچ ۲۰۰۴ء،ص ۱۷۔۳۲

۸۔ اختلافِ قراءت اور احادیثِ نبوی ﷺ، تحقیقاتِ اسلامی، ۲۴/۱،جنوری۔مارچ ۲۰۰۵ء،ص ۲۰۔۳۹

۹۔ فتح الرحمٰن کا ایک تجزیاتی مطالعہ،تحقیقاتِ اسلامی،۲۴/۴، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۵ء،ص ۲۹۔۶۰

۱۰۔ تدوینِ قرآن مجید کی روایات کا تجزیہ،تحقیقاتِ اسلامی،۳۴/۴،اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۵ء،ص ۴۳۔۵۳

۱۱۔ جنت میں داخلہ کی قرآنی ضمانتیں اور حدیثی تشریحات، تحقیقاتِ اسلامی،۳۹/۳، جولائی۔ستمبر ۲۰۲۰ء،ص ۵۵۔۶۸

(ششماہی علوم القرآن،علی گڑھ)

۱۲۔ صدر اول میں تفسیرِ قرآن کے مصادر (عربی سے ترجمہ)، ششماہی علوم القرآن،۱/۲،جنوری۔جون ۱۹۸۶ء،ص ۵۶۔۸۷

۱۳۔ فنِّ تفسیر کے ارتقاء میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا حصہ،علوم القرآن،۱/۳، جولائی۔دسمبر ۱۹۸۶ء،ص ۸۳۔۱۰۲

۱۴۔ ازواجِ مطہراتؓ کی تفسیری روایات۔ایک تجزیاتی مطالعہ، علوم القرآن (دو قسطیں)،۲/۵، جولائی۔دسمبر ۱۹۹۰ء،ص ۸۔ ۴۰؛ ۶/۱-۲،جنوری۔دسمبر ۱۹۹۱ء،ص ۱۹۔۴۸

۱۵۔ متنِ قرآن کریم۔تشریح و تفسیر، علوم القرآن،۸/۱، جنوری۔جون ۱۹۹۳ء،ص ۳۴۔۶۳

۱۶۔ جدید اردو تفاسیر میں نکاح المقت،علوم القرآن،۱۹۔۲۰،جنور ی ۲۰۰۴ء۔ دسمبر ۲۰۰۵ء،ص ۳۲۸۔۳۴۲ (''قرآنی علوم بیسویں صدی میں''۔مقالات سیمینار رخصوصی اشاعت)

۱۷۔غلبۂ مسلم کا قرآنی نسخہ، علوم القرآن ، ۲۲/۲۔۲۴/۱ ، جولائی ۲۰۰۷ء۔جون ۲۰۰۹ء،ص ۳۰۲۔۳۲۰ (''عصرِ حاضر کے مسائل اور قرآنی تعلیمات''۔مقالات سیمینار رخصوصی اشاعت)

(نقوش قرآن نمبر، لاہور)

۱۸۔اللہ اپنے کلام میں، نقوش ر قرآن نمبر،جلد اول،شمارہ نمبر۔۱۴۳، ۱۹۹۸ء،ص ۱۸۵۔۳۵۰

۱۹۔ سورۃ الحمد کی تفسیرِ ربّانی، نقوش رقرآن نمبر،جلد اول،شمارہ نمبر۔۱۴۳، ۱۹۹۸ء،ص ۴۵۵۔۶۱۹

۲۰۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔حمدِ اولین، نقوش رقرآن نمبر،جلد دوم،شمارہ نمبر۔۱۴۴، ۱۹۹۸ء،ص ۴۵۔۱۴۶

۲۱۔ تفسیر سورۃ الحمد۔عہد بہ عہد،نقوش رقرآن نمبر،جلد دوم،شمارہ نمبر۔۱۴۴، ۱۹۹۸ء،ص ۱۴۷۔۴۱۴

۲۲۔ تفاسیرِ قرآنی میں توحیدِ الٰہی ،نقوش رقرآن نمبر، جلد سوم،شمارہ نمبر۔۱۴۵، ۲۰۰۱ء،ص ۵۲۔۱۰۹

(مجموعہ مقالاتِ سیمینار''ادارہ علوم اسلامیہ،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی قرآنی خدمات'' رمنعقدہ زیرِ اہتمام شعبۂ اسلامک اسٹڈیز،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بتاریخ ۲۲۔۲۳ر فروری ۲۰۲۰ء) [زیرِ طبع]

۲۳۔ ادارہ علوم اسلامیہ کی فراموش شدہ قرآنی خدمات (کلیدی خطاب)،مقالاتِ سیمینار'' ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی قرآنی خدمات''[منعقدہ ۲۲۔۲۳ ر فر وری ۲۰۲۰ء]، پبلیکیشنز ڈویژن،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ، ۲۰۲۰ء،ص ۱۶۔۳۱ اللہ رب العزت استاد مکرم پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی مرحوم کی نیکیوں کو قبول فرمائے،انہیں اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے اور جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔آمین ثم آمین۔

☆☆☆

❑ شخصیات

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی علیہ الرحمہ

(۲۶؍دسمبر ۱۹۴۴-۱۵؍ستمبر ۲۰۲۰ء)

حیات وخدمات

ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
شعبۂ عربی، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

بیسویں صدی کے نصف آخر کے آسمان علم وادب پر متعدد اہل وفضل کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے جن کی ضیاء پاشیوں سے دنیا مستفیض ہوتی رہی ہے۔اس کہکشاں کے ایک نمایاں اور روشن حصہ کو پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ان کی ذات والاصفات کو مجمع البحرین کے بجائے مجمع البحار قرار دیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی کے اہم ترین قدیم وجدید علمی مراکز -دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی- میں تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے فکر وفن کو جلا بخشی تھی۔انھوں نے ایک بھرپور علمی زندگی گذاری اور اپنے پیچھے قرآنیات، سیرت نبوی، اسلامیات اور تاریخ جیسے فنون میں ایک گرانقدر سرمایہ چھوڑ کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوگئے ہیں جہاں یقینی طور پر اپنی علمی خدمات، خاص طور سے فن سیرت کی نمایاں اور اہم ترین خدمات کے نتیجہ میں بہترین جزا سے نوازے جارہے ہوں گے۔

خاندان

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی علیہ الرحمہ کا تعلق ایک غیر علمی اور تجارتی خانوادہ سے تھا۔انھوں نے اپنی عمر کے آخری پڑاؤ میں اپنی مختصر خودنوشت لکھی ہے جس کے مطابق ان کے دادا بہار علی بن روشن علی علیہما الرحمہ قصباتی تجارت سے منسلک تھے اور صرف ایک تاجر تھے اور تقریباً ناخواندہ تھے۔ان کے دادا روشن نگر سے کنجا نامی گاؤں میں جا بسے تھے اور وہاں سے مختلف وجوہات کی بنا پر گولا منتقل ہوگئے تھے اور وہیں ایک وسیع گھر بنا کر سکونت اختیار کر لی اور گھر کے ایک حصہ کو دوکان میں تبدیل کر کے تجارت میں مصروف ہوگئے۔

والدین ماجدین

پروفیسر صدیقی ندویؒ کے دادا کے چار بیٹے تھے:حسن علیؒ، عاشق علیؒ، انعام علیؒ اور معصوم علیؒ اور چاروں تجارت/ زراعت/مزدوری وغیرہ کرتے تھے۔پروفیسر صدیقی ندویؒ کے والد محترم کا نام انعام علی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۷؍جولائی ۱۹۸۵ء) تھا۔ان کی خواہش حافظ، قاری اور عالم دین بننے کی تھی اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے اس وقت کے مشہور ومعروف علمی مرکز فرنگی محل جانا چاہتے تھے لیکن اپنی خواہش کے باوجود تعلیم حاصل نہ کر سکے کہ ان کے والد محترم بہت زیادہ پڑھنے پڑھانے کے قائل نہ تھے اور براہ راست کارزار زندگی میں مصروف عمل ہونے کے قائل تھے لہذا انھوں نے انھیں اپنے ساتھ تجارت میں لگا دیا اور انھوں نے اپنی خواہش کا گلا دباتے ہوئے والد

محترم کی خواہش پر لبیک کہا اور پوری تندہی کے ساتھ تجارت میں مصروف ہوگئے اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ وہ پورا کاروبار سنبھالنے کے قابل ہوگئے۔

اللہ تعالی نے ان کے کاروبار میں بہت خیر و برکت دی تھی ان کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ مٹی کو ہاتھ لگائیں تو وہ سونا بن جاتا ہے۔انھوں نے اس زمانہ میں اپنے بڑے بھائی کے نام کو شامل کرتے ہوئے ''عاشق علی انعام علی اینڈ سنز سائیکل مرچنٹ'' نامی فرم بنائی تھی جس میں ان کے بڑے بھائی مرحوم کا کسی بھی قسم کا کوئی مالی اور عملی تعاون شامل نہیں تھا۔انھوں نے اپنے بڑے بھائی کو اپنے کاروبار میں صرف اس لیے شامل کیا تھا کہ ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔اس اشتراک پر ان کے والد مرحوم کو اعتراض تھا کہ جب وہ کسی بھی قسم کا تعاون نہیں کرتے ہیں تو انھیں کاروبار میں کیوں شریک کیا جائے۔اس اعتراض کو بھی کو انھوں نے خندہ پیشانی سے قبول کرلیا اور اپنے چھوٹے بھائی انعام علی کو کاروبار میں شریک کرتے ہوئے فرم کا نام ''انعام علی معصوم علی اینڈ سنز سائیکل مرچنٹ گولا'' میں تبدیل کردیا۔اس فرم کی مالیت کا اندازہ آج کل کار کے کسی بڑے شوروم سے کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں سائیکل ہی سواری کا بنیادی ذریعہ اور وسیلہ تھی اور وجہ عزت وافتخار بھی۔

دنیاوی معاملات میں خدا کی کارفرمائیاں ہمیشہ جاری وساری رہتی ہیں لہذا محترم انعام علیؒ کی کسی حد تک تعلیم کا بندوبست گولا میں ہی ہوگیا،سید سعید احمد خیرآبادی علیہ الرحمہ نے اپنے پیر مقبول میاںؒ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گولا میں ایک مدرسہ کھولا اور بلا تفریق مذہب وملت اس میں علاقہ کے بچوں کو تعلیم دینے لگے،تعلیم کو حاصل کرنے کی اپنی فطری خواہش کی بنا پر وہ تجارت میں والد محترم کا ہاتھ بٹانے کے ساتھ ساتھ مدرسہ بھی جانے لگے اور بہت جلد استاد کے چہیتے شاگرد بن گئے، انھوں نے اپنے استاد سید سعید احمد علیہ الرحمہ سے اردو،فارسی اور انگریزی زبان سیکھی تھی اور اسلامیات کا درس لینے کے ساتھ ساتھ ہی تصوف کی عملی مشق بھی کی تھی۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ گولا میں مدرسہ قائم کرنے سے قبل سید سعید احمد خیرآبادی علیہ الرحمہ انٹرنس کا امتحان پاس کرچکے تھے اور کسی سرکاری نوکری کے فراق میں تھے لیکن چونکہ ان کی قسمت میں گولا جیسے علاقہ میں دینی ودنیاوی تعلیم کی روشنی پھیلانا لکھا تھا لہذا اپنے پیر کے حکم کو بغیر کسی تردد کے قبول کرلیا اور گولا میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جس نے علاقہ کی دینی ودنیاوی تعلیم کو کسی حد تک پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دینی ماحول بھی پیدا کردیا تھا۔اسی مدرسہ نے آگے چل کر''مدرسہ حیاتیہ اسلامیہ''،گولا کی شکل اختیار کرلی تھی۔

ان کے والد محترم چونکہ اپنی خواہش کے باوجود پڑھ نہ سکے تھے لہذا اپنی تشنہ خواہش کی تکمیل کا یہ ذریعہ نکالا کہ اپنے بھتیجوں کی تعلیم وتربیت کا بیڑہ اٹھا لیا۔بعد ازیں انھوں نے اپنے بیٹوں کی تعلیم پر بھرپور توجہ دی اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے دو بیٹوں-پروفیسر صدیقی علیہ الرحمہ اور پروفیسر ادریس صدیقی، سابق صدر شعبہ اقتصادیات،بریلی یونیورسٹی،مقیم حال کناڈا-نے اعلی تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے اپنے شعبوں میں صدارت کے عہدہ پر فائز ہوئے اور اپنی ملازمت کی مدت کو بہت خوش اسلوبی سے پورا کیا۔

پروفیسر صدیقی ندویؒ کے والد محترم کی سماج میں بہت عزت وقدر تھی اور ہندو ومسلمان سب ان سے یکساں طور پر محبت کرتے تھے اور ان کے احترام میں بچھے رہتے تھے۔ان کی سماجی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور وہ بلا تفریق مذہب وملت سب کی دادرسی کرتے تھے۔وہ برادران وطن کے تیوہاروں میں بھرپور حصہ لیتے تھے اور ان کی خوشیوں میں شریک ہوکر خوش ہوتے تھے اور ان کے غم واداسی میں شامل ہوکر مغموم واداس ہوجاتے تھے۔ان کی عزت واحترام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندو مسلم تیوہاروں پر راشن کی تقسیم کی ذمہ داری ان ہی کے کاندھوں پر رہتی تھی۔انھوں نے اپنے علاقہ میں علم کی

روشنی پھیلانے کی خاطر انھوں نے اپنے دودوستوں کے ساتھ ''مدرسہ حیاتیہ اسلامیہ گولا'' کو قائم کیا جس نے اس علاقہ میں تعلیم کی جوت جگائے رکھنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔اواخر عمر میں ان کی خدمات کے پیش نظر انھیں آنریری مجسٹریٹ بھی بنادیا گیا تھا۔

پروفیسر صدیقی ندوی علیہ الرحمہ نے اپنے والد کا خاکہ اپنی غیر مطبوعہ خودنوشت میں ان الفاظ میں کھینچا ہے''بابا جان مولوی انعام علی خاصے پڑھے لکھے اور ساختہ پرداختہ تھے۔اردو، کسی حد تک فارسی وعربی اور انگریزی سے واقف تھے اور ذہانت وفطانت کے پیکر اور عقل سلیم کے مالک تھے۔فطری طور سے وہ عبقری شخص تھے۔رکھ رکھاؤ رعب وداب اور جلال وجبروت کے ساتھ خوش مزاج اور صلح کل کے آدمی تھے۔میری تعلیم وتربیت میں اور پرورش وپرداخت میں اماں سے زیادہ بابا کا حصہ وکردار رہا، جسم کی ساخت ماں سے اور فکر ودماغ باپ سے پایا۔عام بچوں کے برخلاف مجھے ماں سے کم اور باپ سے زیادہ لگاؤ تھا۔اماں سے محبت اور باپ سے عشق تھا۔فطری اور عملی اعتبار سے میں باپ کا پرتو ہوں۔فطری لگاؤ کے علاوہ بابا جان سے میرا بہت گہرا بلکہ اتھاہ تعلق بچپن سے ہوش مندی کی عمر سے قبل ہی رہا اور ہوش سنبھالنے کے بعد میں بابا کا ہی فرزند رہا''۔

پروفیسر صدیقی ندویؒ کی والدہ کا نام تسلیم بی بی (۱۹۲۰-۱۹۹۲ء) تھا جو عرف عام میں تسلیمن کہلاتی تھیں اور اس عہد کے مزاج کے مطابق ناخواندہ تھیں لیکن بقول پروفیسر صدیقی ندوی علیہ الرحمہ''یاداشت اور ذہانت وفطانت میں وہ بقول شخصے آسمان میں تھگلی لگاتی تھیں۔انھیں خداداد صلاحیتوں کی بنا پر نہ جانے کس طرح کہاوتوں، حکیمانہ جملوں اور اشعار کو برملا اور برمحل چسپاں کردیتی تھیں''۔

ان کی والدہ محترمہ اپنے سماجی ماحول کی بنا پر تعلیم کی اہمیت کو سمجھنے کے باوجود صرف ایک حد تک بلکہ معمولی شد بد کی حد تک تعلیم کی قائل تھیں جب کہ والد محترم اپنی تعلیمی کمی کو اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر دور کرنا چاہتے تھے لہذا جب پروفیسر صدیقی ندویؒ کو حصول تعلیم کی خاطر لکھنؤ بھیجنے کا پروگرام بنا تو سخت نالاں ہوئیں لیکن چونکہ شوہر نامدار کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہیں تھی لہذا ناپسندیدگی کے باجود ان کے فیصلہ پر سر جھکا لیا۔ندوۃ العلماء کی طرح جب وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ جانے لگے تو ایک مرتبہ انھوں نے پھر مخالفت کی لیکن شوہر اور بیٹے کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور غالبا علی گڑھ جاتے وقت سابقہ تجربات کی بنا پر کسی قسم کی مخالفت نہیں کی کہ زبان خالی کرنے سے کیا فائدہ۔تعلیم کے تئیں ان کا یہ رویہ اور ان کی مخالفت بھی ان کی محبت کا ہی ایک حصہ تھی کہ وہ چاہتی تھیں کہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے بجائے وہ اپنے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹائیں اور ان کے آرام کا خیال رکھیں۔

انھوں نے بچوں کی تعلیم وتربیت میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا پروفیسر صدیقی ندویؒ نے اپنی والدہ کو یوں خراج عقیدت پیش کیا کہ''جب اردو وفاقی یونیورسٹی پاکستان کی خاتون ڈین نے ان سے یہ پوچھا کہ ہم اپنی اولاد کے لیے کیا کریں کہ وہ یٰسین مظہر بن جائیں تو انھوں نے یہ جواب دیا تھا کہ اس کے لیے آپ کو میری ماں جیسا بننا پڑے گا''۔

پیدائش اور ابتدائی تعلیم وتربیت

ان کی پیدائش ۲۶؍دسمبر ۱۹۴۴ء کو گولا کے ایک خوشحال اور تجارت پیشہ گھرانے میں ہوئی تھی اور ابتدائی تعلیم وتربیت اس وقت کے ماحول اور دستور کے مطابق''ماں کی گود سے شروع ہوئی اور باپ کی گود میں پروان چڑھی''۔پروفیسر صدیقی ندوی علیہ الرحمہ کے والد چونکہ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرسکے تھے جس کی کسک اور غم انھیں تاعمر رہا لہذا انھوں نے اپنی اس کسک کو کسی قدر کم کرنے کے لیے یہ منت مان لی تھی کہ اپنے پہلے بیٹے کو عالم دین بناؤں گا اور اپنی اس منت کو پورا کرنے کے لیے مختلف قسم کی تگ ودو کی تھی۔

پروفیسر صدیقی ندوی علیہ الرحمہ کی باقاعدہ بسم اللہ کا آغاز

ان کے دادا استاد سید سعید احمد علیہ الرحمہ کے ہاتھوں ہوا اور گولا میں ان کے قائم کردہ مدرسہ میں ان کا نام درجۂ اطفال میں لکھوایا گیا جہاں وہ دادا استاد کی شفقتوں اور محبتوں سے ہم آشنا ہوتے رہے۔اس مدرسہ کے دیگر اساتذہ میں ماسٹر رضا علی (ریاضی) اور مولانا غلام محمد قاسمی علیہما الرحمہ شامل تھے۔مؤخر الذکر نے ان کی تعلیم وتربیت میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔بابا جان اور مولانا غلام محمد قاسمی علیہما الرحمہ کی سنگت میں پروفیسر صدیقی ندوی علیہ الرحمہ کو مطالعہ کا کچھ ایسا چسکا لگا کہ وہ آخر عمر تک برقرار رہا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی آغوش میں

مدرسہ حیاتیہ اسلامیہ، گولا میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے بابا کو ان کی اعلیٰ تعلیم کی فکر ستانے لگی، انھوں نے انھیں عالم دین بنانے کی منت مانی تھی۔اس وقت چہار سو دارالعلوم دیوبند کا شہرہ تھا، ملک کے مختلف حصوں میں وہاں کے فارغین خدمت علم ودین میں مصروف عمل رہتے تھے جس کی وجہ سے عمومی ماحول یہ بن گیا تھا کہ دینی اعلیٰ تعلیم کا سب بہترین مرکز دارالعلوم دیوبند ہی ہے۔مولانا غلام محمد قاسمی علیہ الرحمہ کی خدمات جلیلہ کے پیش نظر گولا میں بھی دارالعلوم دیوبند کا ہی بول بالا تھا لہذا ان کے باباجان نے مولانا غلام محمد قاسمی علیہ الرحمہ سے درخواست کی کہ وہ ان کے فرزند ارجمند کو درس نظامی کو پڑھانا شروع کردیں تاکہ دارالعلوم دیوبند میں آسانی سے داخلہ ہوسکے۔انھوں نے اپنے دوست کی درخواست کو قبول کر کے پروفیسر صدیقی ندویؒ کو درس نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھانے بھی لگے تھے لیکن قضا وقدر نے ان کی قسمت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لینا مقدر کردیا لہذا ان کے دادا استاد نے ان کے بابا کو خط لکھا کہ وہ انھیں دارالعلوم دیوبند کی بجائے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ دلائیں اور اس کے متعدد فوائد بھی گنوائے تھے۔اپنے استاد کے حکم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ان کے باباجان لکھنؤ جا پہنچے اور اپنے دوست حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ (۱۹۱۳-۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء) کی خدمت میں پہنچ کر اپنا مسئلہ گوش گذار کیا۔تکوینی امر کے مطابق اتفاق سے اس گفتگو کے دوران ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے ایک طالب علم سید احمد رفیع ندوی علیہ الرحمہ وہاں موجود تھے لہذا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ نے انھیں اپنے دوست کے ساتھ گولا بھیج دیا اور وہ یوں پروفیسر صدیقی ندویؒ کے اتالیق اول برائے دارالعلوم ندوۃ العلماء بن گئے، اتالیق اول نے ان کی تیاری اتنی تندہی سے کرائی کہ وہ درجہ سوم میں داخلہ کے قابل ہوگئے تھے اور داخلہ ٹیسٹ کے وقت مولانا عبدالماجد علیہ الرحمہ مؤلف معلم الانشاء نے انھیں درجہ سوم میں داخلہ کے لائق بھی قرار دیا تھا لیکن ان کا مشورہ یہ تھا کہ درجہ سوم کے لائق ہونے کے باوجود درجہ دوم میں داخلہ لینا زیادہ بہتر ہوگا لہذا ان کے مشورہ کے مطابق ۹/جولائی ۱۹۵۳ء بروز جمعرات ان کا داخلہ درجہ دوم میں ہوگیا اور تعلیم کے مختلف مدارج کو طے کرتے ہوئے ۱۹۵۹ء میں عالمیت کا امتحان پاس کرلیا۔

دارالعلوم ندوہ العلماء میں انھوں نے جن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا ان میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ، قاری منیر صاحب، مولانا عبدالماجد ندوی صاحب، مولانا وجیہ الدین جونپوری صاحب، مولانا عبدالحفیظ آسامی صاحب، مولانا تقی الدین ہلالی اعظمی صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن سلطانپوری صاحب، مولانا مفتی محمد ظہور ندوی صاحب، مولانا معین الدین ندوی صاحب، قاری محمد اسلام صاحب، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی صاحب، ماسٹر عزیز الٰہی حسن پوری صاحب، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی صاحب، مولانا معاذ الاسلام قاسمی صاحب، مولانا محمد منظور نعمانی صاحب، مولانا محمد اسحاق سندیلوی صاحب، مولانا ابوالعرفان ندوی صاحب، مولانا محمد اسباط صاحب علیہم الرحمہ شامل ہیں۔

ان کے باحیات اساتذہ میں حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی صاحب، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب اور پروفیسر محمد راشد ندوی صاحب مدظلہم العالی ہیں۔

مذکورہ بالا اساتذہ میں سے وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی صاحب، مولانا محمد اسحاق سندیلوی صاحب، مولانا ابوالعرفان ندوی صاحب، مولانا محمد اسباط صاحب علیہم الرحمہ اور حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی صاحب اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب -اللہ ان کی عمروں میں برکت دے اور ان کا سایہ تادیر قائم رکھے- خاص طور سے متاثر تھے اور انھیں اپنا اصلی مربی اور معلم قرار دیتے ہیں۔

عالیت کے بعد انھوں نے فضلیت میں داخلہ لے لیا لیکن درجات عالیہ کے اساتذہ کے طرز تدریس سے عاجز ہوکر فضلیت اول کے اواخر میں ندوۃ العلماء کی تعلیم ترک کردی اور لکھنؤ یونیورسٹی کے فاضل ادب میں داخلہ لیا اور سیکنڈ ڈویژن سے کامیاب ہوئے۔ غالباً لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ ہی ندوہ سے ان کے اخراج کا بہانہ بن گیا تھا کہ فضیلت سال اول کے اساتذہ کے طرز تدریس پر سخت نکتہ چینی ارباب اقتدار کے لیے کافی تکلیف دہ تھی اور وہ ان کے اس طرز عمل سے خوش نہ تھے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد مولانا صدیقی ندویؒ کے ساتھ کچھ ایسے حادثات اور واقعات پیش آئے کہ انھوں نے یونیورسٹی کا رخ کرلیا۔ ان واقعات میں سے سب اہم واقعہ درجہ فضیلت کے سال اول میں ان کا ندوہ سے اخراج تھا۔ ان کا ان کے دو ساتھیوں کے ساتھ اخراج کا سبب ناول بینی، مخرب اخلاق ادب پڑھنے اور غیر شرعی وضع قطع اختیار کرنے کو قرار دیا گیا اور انھیں کسی قسم کی صفائی کا موقعہ بھی نہیں دیا گیا۔ اخراج کا سبب مولانا صدیقی ندویؒ کے نزدیک محض الزام تھا لہذا انھوں نے معافی مانگنے سے صاف صاف انکار کردیا جب کہ ان کے دونوں ساتھی معافی نامہ داخل کر کے دوبارہ ہاسٹل میں منتقل ہوگئے تھے۔ اس واقعہ کے نتیجے میں انھیں دل وجان سے عزیز رکھنے والے بابا جان نے بھی سرعام بہت سخت سست کہا لیکن انھوں نے سر جھکانے اور معافی مانگنے سے صاف صاف اور سختی کے ساتھ انکار کردیا۔ بابا جان ان کے رویہ سے کچھ نرم پڑے کہ ان کا بیٹا اگر غلط ہوتا تو اتنا سخت رویہ اختیار نہ کرتا۔ بیٹے کی معروضات سن کر وہ انھیں اپنے ساتھ لے کر اپنے دیرینہ دوست حضرت مولانا سی دابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ان کے مسئلہ کا کوئی حل نکالنے کی درخواست کی لیکن مسئلہ کا کوئی حل نہ نکل سکا بلکہ دونوں کا دل بالترتیب کھٹا اور مزید کھٹا ہوگیا۔

ندوہ سے اخراج نے مولانا صدیقی ندویؒ کی زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ یہ واقعہ ان کی زندگی کا سب بڑا موڑ ثابت ہوا اور وہ دینی ادارہ کی فضا سے نکل کر عصری اداروں کی طرف چل پڑے۔ بقول ان کے ''اس قضیہ نامرضیہ اور حادثہ فاجعہ نے میری زندگی، سوچ، تعلیم اور تربیت پر بہت اثرات مرتب کیے'' جن میں سب سے اہم ان کا عصری اداروں میں داخلہ لینا تھا جیسے لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب کی سند حاصل کرنا اور بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ''انگلش اونلی'' میں ہائی اسکول کا امتحان دینا اور سیکنڈ ڈویژن سے کامیابی حاصل کرنا اور بعد ازیں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اعلی درجات کی سندیں حاصل کرنا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مولانا صدیقی ندویؒ کا ارباب ندوہ سے جو اختلاف تھا وہ اصول وضوابط کی بنیاد پر تھا اس میں ذاتیات کا کہیں بھی شاخسانہ نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تاحیات ندوہ سے اپنے تعلق کو استوار کیے رکھا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور دیگر اساتذہ کی قدم بوسی کرتے رہے۔ انھوں نے اخراج کے مرتب ہونے والے اثرات کا ذکر اپنی غیر مطبوعہ خودنوشت میں کیا ہے کہ ''.....ان تمام تجربات ومعاملات کے سب سے عمدہ پہلو تھے کہ کبھی حوصلہ نہ ہارا اور جم کر تعلیم حاصل کی اور اپنا اعتبار برقرار رکھا اور اساتذۂ کرام اور ارباب ندوہ کے احترام وادب میں ذرا کمی نہ کی، نہ ہی

ان کے خلاف رنجش وکینہ پالا۔ یہ اللہ کا بڑا فضل رہا۔ اور ان کی علمی خدمت بھی کرتا رہا اور مولانا کے جناب میں بھی حسب معمول حاضری بھی دیتا رہا۔ ان کی وسعت قلب اور کرم ہائے بیکراں کا بھی اعتراف ہے کہ انھوں نے راندۂ درگاہ سے محبت وشفقت کا برتاؤ اور سلوک برقرار رکھا''۔

۱۹۵۳ تا جولائی ۱۹۶۰ء کا عرصہ گذار کر جب وہ گولا پہنچے تو والدین کے اصرار پر اس شرط پر شادی کرنے پر راضی ہوگئے کہ تعلیم کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ لہذا ۱۹۶۰ء میں ہی شادی خانہ آبادی بھی ہوگئی۔ شادی کے بعد ان کے بابا جان نے ان کے لیے گولا میں ہی ایک میڈیکل اسٹور کھول دیا کہ تجارت کے ساتھ ساتھ کار رشد وہدایت بھی انجام دے سکیں لیکن ان کا دل اس کار تجارت میں نہ لگ سکا اور وہ افسردہ رہنے لگے حتی کہ اس کا احساس ان کے والدین کو بھی ہوگیا لہذا انھوں نے اس افسردگی کا سبب معلوم کیا تو انھوں نے بلا کسی جھجک کے اپنے پیارے بابا جان سے کہہ دیا کہ کیا آپ نے مجھے صرف دوکان داری کی خاطر اس قدر تعلیم دلائی تھی۔ انھوں نے ان سے ان کی خواہش پوچھی تو انھوں نے عصری تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کر دیا اور قسمت انھیں کشاں کشاں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی طرف لے کر چل پڑی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں داخلہ اور وہاں کے شب وروز

بابا جان سے اپنی خواہش وتمنا کے اظہار کے بعد وہ لکھنؤ روانہ ہوگئے کیونکہ وہیں عصری تعلیم حاصل کی جاسکتی تھی۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے اپنی متروکہ فضلیت پوری کرنی چاہی لیکن ارباب اقتدار ندوہ اس پر راضی نہ ہوئے جس سے وہ وہاں کی انتظامیہ سے مزید بے مزہ ہوگئے۔ اسی بدمزگی کے دوران اتفاق سے ان کی ملاقات پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی، سابق صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے ہوگئی۔ انھوں نے مولانا صدیقی ندویؒ کو گلے سے لگایا اور کہا کہ ''تم خوب ملے، ہم لوگ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہائر سکنڈری/خصوصی درجہ کرنے جارہے ہیں، تم بھی یہاں تنگ ہو، ہمارے ساتھ جامعہ چلو''۔ سید صاحب علیہ الرحمہ نے فوری ایکشن لیتے ہوئے ایک پوسٹ کارڈ پر درخواست داخلہ لکھوائی اور ارباب جامعہ کو بھیج دی۔ ایک ہفتے کے اندر انھیں جامعہ کا داخلہ فارم مل گیا جسے انھوں نے بھر کر بھیج دیا اور ۵/اگست ۱۹۶۰ء کو انھیں جامعہ میں داخلہ کا پروانہ مل گیا اور سوئے جامعہ چل پڑے۔

۱۶/اگست کو جامعہ پہنچ کر انھوں نے داخلہ کی کاروائی پوری کی اور وہاں فارغین مدرسہ کے لیے تجرباتی طور پر قائم درجہ خاص میں داخل ہوگئے۔ اس درجہ خاص میں دس طلباء کا داخلہ ہوا تھا جن میں سے تین ندوۃ العلماء کے فارغین اور چار دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے والے طلباء تھے۔ ان کے علاوہ مظاہر العلوم، سہارن پور، مدرسۃ الاصلاح، اعظم گڑھ اور مفتاح العلوم سے فارغ ہونے والے ایک ایک طالب علم کا داخلہ ہوا تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درجۂ خاص کے اساتذۂ صدیقیؒ میں عابد ملک صاحب، نورالدین صاحب، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب (پرنسپل کالج)، سید مجاہد حسین زیدی، قاضی محمد احمد صاحب اور پروفیسر عاقل صاحب علیہم الرحمہ شامل تھے۔ اتفاق سے ان پانچ اساتذہ میں سے تین -عابد ملک صاحب، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب (پرنسپل کالج)، قاضی محمد احمد صاحب- نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے علاوہ بھی ان کے اساتذہ میں علی گڑھ کے فارغین تھے جیسے بی ایڈ کے استاد مسرور ہاشمی صاحب جنھوں نے انھیں بی ایڈ کے لیے ان فٹ قرار دیا تھا اور انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جا کر تاریخ میں ایم اے کرنے کا نہ صرف مشورہ دیا تھا بلکہ انھیں برابر یاد دہانی بھی کراتے رہتے تھے۔

درجہ خاص کے امتحان کو مولانا صدیقی ندویؒ نے امتیازی نمبرات سے پاس کیا اور اسکالرشپ کے مستحق ٹھہرے اور ۱۹۶۲ء میں بی اے- تاریخ، پولیٹکل سائنس اور انگلش لٹریچر- میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۶۴ء میں سیکنڈ ڈویژن میں اچھے نمبرات سے بی اے

میں کامیابی حاصل کی۔

بی اے میں جن اساتذہ کے سامنے انھوں نے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا ان میں مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی صاحبؒ، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی صاحبؒ، سید ابوالکاظم قیصر زیدی صاحبؒ، مجیب رضوی صاحبؒ، محمد ادریس صاحبؒ، شاستری صاحب، سنگھ صاحب (لازمی مضامین)، مجاہد حسین زیدی صاحبؒ، اقتدار حسین صدیقی صاحبؒ، پروفیسر محبّ الحسن خان صاحبؒ، رفاقت علی خان صاحبؒ، پروفیسر محبّ الحسن خان صاحبؒ (اختیاری مضمون: تاریخ)، بینائی صاحبؒ، بلگرامی صاحبؒ اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحبؒ (اختیاری مضمون: پولیٹکل سائنس)، سنگھ صاحب، مسز ٹکرو صاحبہ اور انور صدیقی صاحبؒ (اختیاری مضمون: انگلش لٹریچر) جیسے اساتذہ شامل ہیں۔

مولانا صدیقی ندویؒ جامعہ ملیہ کے جن اساتذہ سے زیادہ متاثر ہوئے تھے ان میں مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی صاحب، قیصر زیدی صاحب، محمد ادریس صاحب، مجاہد حسین زیدی صاحب اور انور صدیقی صاحب علیہم الرحمہ شامل ہیں۔

بی اے کرنے کے بعد مولانا صدیقی ندویؒ نے ایم اے کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا لیکن کہاں سے کیا جائے اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکے تھے۔ تاہم کسی کی تحریک پر دہلی یونیورسٹی میں ایم اے پولیٹکل سائنس میں داخلہ لے لیا لیکن اس کی تکمیل نہ کر سکے کہ ان کا داخلہ بی ایڈ میں بھی ہو گیا تھا۔ انھوں نے بطور احتیاط ہی بی ایڈ کا فارم بھرا تھا داخلہ لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ دہلی یونیورسٹی میں ایم اے پولیٹکل سائنس میں داخلہ ہو جانے کے بعد بی ایڈ کا ناپختہ ارادہ مزید ناپختہ ہو گیا لیکن قضا وقدر کے آگے کس کی چلی ہے کہ ان کی چلتی لہذا جب بی ایڈ کے داخلہ ٹیسٹ کے نتیجہ کا اعلان کیا گیا تو انھیں پانچ ہزار طلباء میں سے پہلی پوزیشن کا مالک قرار دیا گیا کہ انھوں نے اس ٹیسٹ کو ٹاپ کیا تھا۔ پہلی پوزیشن حاصل کرنے کے باوجود ان کا ارادہ بی ایڈ میں داخلہ لینے کا نہیں تھا لیکن اپنے محترم استاد مجیب رضوی اور دیگر بہی خواہوں کے محبت بھرے اصرار پر ایم اے کے مقابلہ میں بی ایڈ کرنے کو ترجیح دی۔ ان بہی خواہوں کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ کالج کے قیام-۱۹۳۸ء- کے بعد کسی طالب علم نے امتحان کو ٹاپ کرنا تو درکنار کوئی طالب علم جنرل لسٹ (دس اولیں طلباء کی لسٹ) میں بھی جگہ نہیں بنا سکا تھا لہذا جامعہ کی عزت کی خاطر انھیں بی ایڈ میں داخلہ لے لینا چاہیے۔ تحریری امتحان کے بعد زبانی امتحان ہوا اور دونوں امتحانوں کو ملا کر جب فائنل لسٹ کا اعلان کیا گیا تو بی اے میں سیکنڈ ڈویژن ہونے کی وجہ سے ان کا نام لسٹ میں دوسرے نمبر پر تھا۔ اس نمایاں کامیابی پر انھیں نیشنل اسکالر بھی ملا تھا۔

بی ایڈ کے اساتذۂ صدیقیؒ میں محمد اسماعیل صاحب، جنید صاحب، سنگھ صاحب، مسرور ہاشمی علیگ صاحب اور محمد یوسف صاحب، معین اعظمی صاحب، شعیب جامعی صاحب، مسز رنگاناتھن صاحبہ، سلامت اللہ خاں صاحب، عبداللہ ولی بخش قادری صاحب اور ابوالکلام صاحب جیسے اساتذہ شامل تھے۔ اللہ ان کے تمام مسلمان اساتذہ پر اپنے رحم وکرم کی بارش فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انھوں نے بھرپور طالب علمانہ زندگی گزاری لیکن کہیں بھی اپنے وقار کو مجروح نہ ہونے دیا۔ جامعہ میں وہ مختلف قسم کی علمی وادبی سرگرمیوں کے ساتھ ہی ساتھ کچھ غیر علمی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ مختلف قسم کی تفریحات کرتے تھے لیکن اپنی دینی وجاہت کا خیال بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے شروع دن سے ہی جامعہ میں امامت کے فرائض انجام دینے شروع کر دیے تھے اور متفقہ طور پر ''امام جامعہ'' قرار دے دیے گئے تھے۔ اپنے اس منصب پر وہ تاحیات جامعہ قائم رہے جس نے اس وقت جامعہ کی دینی فضا کو سازگار بنانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔

اس غیر سرکاری منصب کے ساتھ ساتھ وہ پراکٹوریل مانیٹر

کے سرکاری عہدہ پر بھی دو سال تک فائز رہے اور جامعہ آنے والے مہمانوں کا استقبال کرتے رہے۔انھوں نے اس ضمن میں ایک واقعہ سنایا تھا کہ ایک موقعہ پر پنڈت جواہر لال نہرو جامعہ تشریف لائے تھے اور وہ حسب معمول ان کے استقبال میں کھڑے تھے۔دوستوں نے ازراہ تفنن ان کی شیروانی پر دفتی کے ایک ٹکڑے پر PM لکھ کر چسپاں کر دیا تھا۔جب پنڈت جی ان کے پاس سے گذرے تو ایک لمحہ کے لیے ان کے پاس رکے اور مسکرا کر کہا کہ اس وقت یہاں دو PMs موجود ہیں ایک تم اور ایک میں۔اس واقعہ کو سنا کر وہ پنڈت جی کی ذہانت وفطانت کا ذکر کرتے تھے کہ وہ کس طرح بات سے بات نکال لیتے تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سائے تلے میں

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی اے کرنے کے بعد ایم اے کہاں سے کیا جائے کا مسئلہ درپیش آیا۔اس ضمن میں جامعہ کے ساتھ ساتھ دہلی یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام پر غور وخوض کیا گیا اور کسی بھولے بسرے ساتھی کے کہنے پر دہلی یونیورسٹی میں پولیٹکل سائنس میں داخلہ بھی لے لیا لیکن تکوینی امر کے مطابق انھیں بی ایڈ کرنا پڑا جہاں انھیں مسرور ہاشمی علیگ جیسا استاد ملا جو انھیں بی ایڈ کے لیے بالکل ان فٹ سمجھتے تھے لہذا انھیں اٹھتے بیٹھتے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے (تاریخ) کا مشورہ دیتے رہتے تھے۔کلاس میں بار بار کی یاد دہانی بعض ساتھیوں کے لیے بار خاطر بھی بن جاتی تھی لیکن وہ اپنی دھن کے پکے تھے لہذا ہر وقت یاد دہانی کرتے رہتے تھے۔ان سے پہلے ان کے محبوب استاد مجاہد حسین زیدی (پروفیسر مصطفیٰ حسین زیدی، شعبۂ لائبریری سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے والد محترم) نے بھی انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہی مزید تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا جسے انھوں نے گرہ سے باندھ رکھا تھا۔مسرور ہاشمی صاحب کے پیہم اصرار نے علی گڑھ جانے کے ارادہ کو اور پختہ کر دیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ارباب حل وعقد کی مختلف قسم کے وعدوں اور اپنے اساتذہ کے اصرار کے باوجود کوچۂ علی گڑھ کی جانب چل پڑے جو اس وقت بلکہ اب بھی امت مسلمہ کی سب سے بڑی علمی دانش گاہ ہے اور جسے مولانا صدیقی ندویؒ نے اپنی خودنوشت میں ''منزل مقصود'' قرار دیا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ

علی گڑھ پہنچنے اور وہاں کے داخلہ فارم کے حاصل کرنے کی بھی ایک کہانی ہے کہ جب وہ علی گڑھ پہنچے تو دفاتر بند ہو چکے اور یہ فکر لاحق ہو چکی تھی کہ رات کہاں اور کیسے گذاری جائے گی۔اسی فکر میں وہ مبتلا تھے ایک شخص نے ان سے مدعا احوال پوچھا اور انھوں نے بلا کم وکاست بتا بھی دیا۔وہ ان کے حق میں فرشتہ ثابت ہوئے کہ دفتر بند ہو جانے کے باوجود انھیں فارم دیا اور مکمل طور پر بھر کر تاریخ نکل جانے سے قبل فارم جمع کرانے کی نصیحت بھی۔انھوں نے ان کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے فارم بھر کر بھیج دیا اور یوں قسمت انھیں کشاں کشاں سوئے دانش گاہ سرسید لے گئی کہ ان کا رزق وہاں ان کا انتظار کر رہا تھا۔یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایک خاص پہچان اور شناخت رہی ہے کہ یونیورسٹی کے متعلقین اور طلباء اس سرزمین پر آنے والے داخلہ کے خواہش مند طلبہ کی حتی الامکان مدد کرتے ہیں اور ان کے مسائل کا مداوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مولانا یٰسین مظہر صدیقیؒ کا داخلہ جولائی ۱۹۶۶ء میں شعبۂ تاریخ میں ہوا تھا۔ان کی کلاس دس طلباء پر مشتمل تھی۔یہی تعداد جامعہ ملیہ کے خصوصی درجہ میں بھی تھی لیکن فرق یہ تھا کہ ایم اے میں انھیں کے الفاظ میں خواتین اور خواتان کی تعداد برابر برابر تھی۔اس زمانہ میں مخلوط تعلیم ہونے کے باوجود شعبۂ تاریخ میں طلبہ اور طالبات الگ الگ قطاروں میں بیٹھتے تھے۔مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے انھوں نے سیکنڈ ڈویژن اور تھرڈ پوزیشن سے ایم اے پاس کر لیا۔ان کے بقول ان کی سیکنڈ ڈویژن ارباب شعبہ کی کرم فرمائی کے نتیجہ میں آئی تھی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ صدیقیؒ میں پروفیسر محمد

حبیب صاحب، پروفیسر سید نورالحسن صاحبؒ، پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحبؒ، پروفیسر عبدالوحید قریشی صاحبؒ، پروفیسر آر سی گوڑ، ڈاکٹر ضمیر الدین صدیقی صاحبؒ، ڈاکٹر اطہر علی صدیقی صاحبؒ، ڈاکٹر محمد ذکی صاحبؒ، کیپٹن افتخار راحمد صاحبؒ، جے وی سنگھ، احسن جان قیصر صاحبؒ جیسے ماہرین فن شامل تھے جن سے انھوں بہت کچھ سیکھا تھا اور عملی زندگی میں ان سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس شعبہ کے اساتذہ میں اس وقت صرف پروفیسر عرفان حبیب باحیات ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔

۱۹۶۸ء میں ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے ایم فل کرنے کا ارادہ کرلیا کہ ایم اے میں سیکنڈ ڈویژن اور تھرڈ پوزیشن آنے کے باوجود پروفیسر عرفان حبیب صاحب نے انھیں اپنی نگرانی میں ایم فل کرانے کو کہا تھا اور موضوع بھی طے کردیا تھا: Leagal System of the Mughal Empire لیکن بقول ان کے بلائیں ان کے پیچھے پیچھے لگی رہتی ہیں لہذا فرمان نظامی جاری ہوا کہ ایم فل میرے ساتھ کروگے اور موضوع ہوگا امیر خسرو کی اعجاز خسروی میں موجود تاریخی مواد کا مطالعہ۔ جولائی ۱۹۶۸ء میں ان کا داخلہ ایم فل میں ہوا تھا اور ایک سال کے اندر ایم فل کا مقالہ جمع کرنے کا حکم صادر ہوا تھا جسے بہت زیادہ منت وسماجت کے بعد مقالہ جمع کرنے کی تاریخ میں ۳۱/اکتوبر ۱۹۶۹ء تک توسیع کردی گئی۔

ایم فل میں داخلہ کے بعد ۱۱/ستمبر ۱۹۶۸ء کو انھیں JRF کی اسکالرشپ کا پروانہ مل گیا۔ یہ اسکالرشپ ڈھائی سو روپیہ ماہوار پر مشتمل تھی اور پانچ سو کی سالانہ گرانٹ دیگر اخراجات کے لیے الگ سے ملنے والی تھی۔ ایم فل میں کامیابی کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ خود بخود ہوگیا اور نگراں تو پروفیسر خلیق احمد نظامی ہی رہے لیکن موضوع میں جزوی تبدیلی آئی کہ اب اعجاز خسروی کے متن کو ایڈٹ کرنا تھا: A Critical Edition of I'jaz-i Khusravi جسے انھوں حکم حاکم مرگ مفاجات کے تحت قبول کرلیا۔

ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے موضوع مقالات سے انھیں بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی کہ وہ ان کے مزاج کے مطابق نہیں تھے تاہم ڈگری حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ان مقالات کو محنت سے لکھا اور ان کی ڈگریاں بھی حاصل کیں لیکن انھیں کبھی بھی اپنا ''کارنامہ'' نہیں قرار دیا حتی کی وہ نجی گفتگو میں بھی ان کے متعلق کبھی کبھار ہی ذکر کرتے تھے وہ بھی ضمنی طور پر۔ ان مقالات سے ان کی عدم دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نھوں نے ان مقالات کو کبھی چھپوانے کی کوشش بھی نہیں کی اور ابھی تک وہ غیر مطبوعہ ہیں۔

پی ایچ ڈی کی تکمیل کے دوران ہی یکم اپریل ۱۹۷۰ء میں ان کا تقرر ریسرچ اسسٹنٹ کی پوسٹ پر ہوگیا تھا۔ یہ تقرر عارضی طور پر تھا اور اس کا دورانیہ ''تاختم تعلیمی میقات'' قرار دیا گیا تھا۔ اس تقرر کے ساتھ ہی ان کی تعلیم وتربیت کا روایتی زمانہ پورا ہوجاتا ہے حالانکہ انھیں پی ایچ ڈی ڈگری مارچ ۱۹۷۵ء میں تفویض کی گئی تھی۔

ملازمت اور سبکدوشی

شعبۂ تاریخ

مولانا صدیقی ندویؒ نے اپنی ملازمتی زندگی کا آغاز شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا تھا کہ اولین عارضی ملازمت انھیں شعبہ تاریخ میں ہی ملی تھی جس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ یہ تقرری صرف ایک ماہ کی تھی جو کسی وجہ سے ایک ماہ نو دن پر محیط ہوگئی۔ اس عارضی ملازمت کے خاتمہ کے بعد جب ریسرچ اسٹنٹ کی نئی پوسٹ کا سرکاری اعلان ہوا تو انھوں نے بھی عرضی ڈال دی اور سید نورالحسن صاحبؒ کی کوششوں اور کاوشوں سے اس پر ان کا تقرر ایک سال کے لیے ہوگیا۔ اس پوسٹ پر تقرری کے بعد ان کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی کہ ایک طرف وہ اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کر رہے تھے تو دوسری طرف اپنے مشفق استاد مظہر احمد علویؒ کے پروجیکٹ میں ہاتھ بٹا رہے تھے تو تیسری طرف وہ PUC کی کلاس بھی لے رہے تھے کہ بطور ریسرچ

اسسٹنٹ اور JRF کی اسکالرشپ پانے کی وجہ سے کلاس لینا ضروری تھا۔

مولانا صدیقی ندویؒ کی شعبۂ تاریخ میں ریسرچ اسسٹنٹی کا زمانہ تقریباً ۱۴؍سال پر محیط ہے۔ یہ تقرر مکمل طور پر عارضی ہوا کرتے تھے اور ہر سال اس کے لیے سلیکشن کمیٹی کے روبرو حاضر ہونا پڑتا تھا۔ شعبۂ تاریخ میں ان کی ملازمت کا اکثر وبیشتر دورانیہ عارضی تھا اور وہ شعبہ جاتی سیاست کے نتیجہ میں مستقل ملازمین کی فہرست میں جنوری ۱۹۸۳ء کو شامل ہو سکے اور وہ صرف چند مہینوں کے لیے کہ اسی سال ان کا انتخاب بطور ریڈر/ ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر صدیقیؒ کو شعبہ کے ارباب حل واقتدار سے اس معاملہ میں شکایت تھی اور اپنی شکایت کا برملا اور باآواز بلند اظہار بھی کرتے تھے کہ شعبہ جاتی سیاست کا شکار ہونے کی وجہ سے ان کا تقرر نہیں کیا گیا تھا اور انھیں مسلسل تنزلی سے نوازا جاتا رہا لیکن راقم کا رزق کے معاملہ میں اللہ پر پورا یقین وبھروسہ ہے کہ کسی کا رزق کوئی چھین ہی نہیں سکتا ہے لہذا تقرر نہ ہونا دراصل اللہ کی مصلحت اور مرضی پر منحصر ہے کہ ابھی رزق ہی نہیں اترا ہے حالانکہ ظاہر بیں نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ ان کا تقرر فلاں کی وجہ سے نہیں ہوا ہے اور فلاں کا تقرر فلاں کی وجہ سے ہو گیا ہے۔ مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے رزق کا مالک صرف اللہ ہے اور جب وہ اترے گا تو مل کر ہی رہے گا اور اسے کوئی روک نہیں سکتا ہے۔

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز

ڈاکٹر صدیقیؒ کا شعبۂ تاریخ میں مستقل ملازمت کا دورانیہ صرف دس مہینوں پر مشتمل ہے کہ مذکورہ شعبہ میں ان کا تقرر ۲؍جنوری ۱۹۸۳ء میں ہوا تھا اور اسی سال ستمبر ۱۹۸۳ء میں ان کا انتخاب بطور ریڈر/ ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز ہو گیا تھا اور وہ مختلف قسم کی رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے یکم نومبر ۱۹۸۳ء کو وہاں منتقل ہو گئے تھے۔

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں بھی ان کا کھلے دل سے استقبال نہیں کیا گیا اور انھیں ''خارجی'' قرار دے دیا گیا اور ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا گیا تاہم دھیرے دھیرے گرد بیٹھتی چلی گئی کہ روڑے اٹکانے والے یکے بہ دیگرے سبکدوش ہوتے چلے گئے تاہم گرد بیٹھنے میں بھی سالوں کا عرصہ گزر گیا۔ وہ زمانہ بھی ان کی تلخیوں کا زمانہ تھا لیکن چونکہ وہ دھن کے پکے اور اپنے موضوع کے ماہر تھے لہذا نہ کبھی کسی سے دبے اور نہ کسی کو دبانے دیا بلکہ ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے حتی کہ شعبہ کی زمام کار ان کے اختیار میں آ گئی۔

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں بھی پروفیسر شپ کی متعدد سلکشن کمیٹیوں میں ڈاکٹر صدیقیؒ کو مسترد کر دیا گیا تھا جس کے وہ داخلی اور خارجی اسباب بھی بیان کرتے تھے لیکن میری اپنی سوچ کے مطابق ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا لہذا وہ مسترد کر دیے جاتے رہے اور جب وقت آ گیا تو نسیم فاروقیؒ کے دور وائس چانسلرشپ میں ۱۹۹۱ء میں انھیں پروفیسر کے منصب پر فائز کر دیا گیا تاہم اس فیصلہ پر عمل درآمد جون ۱۹۹۴ء میں ہو سکا۔ بحیثیت پروفیسر ان کی ملازمت ۱۲؍سال اور ۶؍ماہ (جون ۱۹۹۴ء تا دسمبر ۲۰۰۶ء) پر مشتمل ہے کہ دسمبر ۲۰۰۶ء میں وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔

پروفیسر صدیقیؒ کی شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں تقرری ان کی من چاہی نہیں تھی اور محض ضد میں مذکورہ شعبہ میں اپلائی کر دیا تھا لیکن فیصلہ تو کہیں اور ہونا تھا لہذا محض ضد میں بھرا جانے والا فارم ان کے لیے بہت سی سوغاتیں لے کر آیا اور انھیں دین و دنیا دونوں میں سرخرو گیا کر۔ شعبۂ تاریخ سے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کی منتقلی کا ذکر انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے ''یکم نومبر ۱۹۸۳ء کو خاکسار نے شعبہ/ مرکز تاریخ کو الوداع کہا اور کس دل سے کہا وہ اس کا دل جانتا ہے کہ اسے اپنے شعبے ومضمون سے عشق صادق تھا'' لیکن مؤخر الذکر شعبہ میں ان کی منتقلی اس لحاظ سے زیادہ قابل ذکر اور قابل قدر ہے کہ ایک عام مؤرخ کے بطن سے ایک سیرت نگار جنم لیتا ہے جسے اس کی گوناگوں خدمات سیرت نبوی

کی بنا پر بجا طور پر برصغیر کا بابائے سیرت قرار دیا جاسکتا ہے۔ قضا وقدر کے فیصلہ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ جن سے جو کام لیا جانا ہوتا ہے اسی لحاظ سے ان کے لیے تمہید سبیل کی جاتی ہے۔

مادر علمی کا ذکر

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کی شخصیت کی تشکیل میں دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ انھیں اس بات کا ادارک بھی تھا اور اعتراف بھی۔ ''مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کے ارتقاء'' نامی اپنی کتاب میں انھوں نے ان اداروں کے تئیں اپنے احساسات وجذبات کا اظہار بہت والہانہ انداز میں کیا ہے۔ اس والہانہ اعتراف میں جہاں ایک طرف ان اداروں کے تئیں ان کی عقیدت ومحبت کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کی شخصیت کی تشکیل کرنے والے بنیادی عناصر کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

''مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کے ارتقاء'' کی تقدیم میں انھوں نے ان اداروں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے'' آخر میں اپنی مادر درس گاہوں - دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی- کے بے پایاں احسانات کا اعتراف کرتا ہوں اور بطور احسان شناسی ان تینوں تربیت گاہوں کے نام اس کتاب کو معنون کرتا ہوں۔ ان میں سے کس کا احسان وکرم بنیادی ہے اس کا فیصلہ کرنا خاصا مشکل ہے۔ ندوہ نے عربی زبان وادب اور علوم اسلامیہ کی آگاہی بخشی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جدید تعلیم وطریقۂ تحقیق سے شناسائی عطا کی اور مسلم یونیورسٹی نے تعلیم وتربیت اور تحقیق کے اعلی معیارات سے نوازا۔ ان میں سے کسی کی آدم گری نہ ہوتی تو ادھورا ہوتا، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ علی گڑھ کا فیضان نہ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا جیسا اب ہوں۔ شبلی گرامی کی مانند یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مولوی شبلی کو شبلی علی گڑھ نے بنایا لیکن یہ خاکپائے شبلی علم وتحقیق اور ادب وآداب سے اسی جہان سرسید میں آشنا ہوا لہذا اس کا احسان عظیم تر ہے اور عظیم ترین کرم پروردگار عالم کا ہے جس نے ان بے کراں انعامات سے نوازا''۔

عہدے اور مناصب

پروفیسر صدیقیؒ اپنی ملازمت کے دوران مختلف عہدوں پر بھی فائز رہے جیسے صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی سیل اور پرووسٹ آفتاب ہال۔ انھوں نے مذکورہ بالا تمام انتظامی ذمہ داریوں کو بہت خوبی سے نبھایا اور عام طور سے کسی کو شکایت کا موقعہ نہیں دیا اور نہ ہی کسی کی حق تلفی۔ انسان کے بس میں نہیں ہے کہ اس کے تمام فیصلوں کو من وعن قبول کرلیا جائے اور نہ ہی اس بات کی استطاعت رکھتا ہے کہ وہ سب کو خوش کرسکے لہذا پروفیسر صدیقی مرحوم کے کچھ فیصلوں سے کچھ لوگوں کو اختلاف تھا اور وہ ان فیصلوں سے خوش نہیں تھے۔

انھوں نے اپنے عہدۂ صدارت میں سیمینار کا جو سلسلہ شروع کیا وہ ابھی تک جاری وساری ہے۔ ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی سیل کی حیثیت بھی انھوں نے کئی ایک بین الاقوامی اور قومی سیمینار کا انعقاد کیا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے اپنی دونوں حیثیتوں میں سیمیناروں کی ایک جھڑی لگا دی تھی تو غلط نہ ہو گا۔ ساتھ ہی ساتھ شاہ ولی اللہ دہلوی کی فکر وفن پر انھوں نے کئی کتابیں بھی شائع کیں۔ اسی طرح بحیثیت پرووسٹ آفتاب ہال بہت سے ملازمین کا تقرر مستقل طور پر کردیا تھا۔

انھیں اسلام کا علمی ورثہ، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی اور الفرقان پروجیکٹ، مؤسسۃ الفرقان لندن کا پرنسپل انویسٹیگیر بھی نامزد کیا گیا اور انھوں نے ان علمی منصوبوں کی نہ صرف ابتداء کردی تھی بلکہ دونوں منصوبوں کی پہلی جلد بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ ان دونوں منصوبوں میں انھوں نے راقم سمیت متعدد افراد کو بھی شامل کررکھا تھا اور ہر ایک نے اپنی اپنی بساط کے مطابق ان کی تکمیل میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔

اول الذکر منصوبہ کے تحت سیرت نبوی کے ۴۹ راہم ترین

مصادر کا تعارف کرایا گیا ہے جسے انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی نے ۲۰۱۶ء میں دو جلدوں میں شائع کردیا ہے۔اس منصوبہ کی پہلی جلد پروفیسر صاحبؒ کے قلم کی مرہون منت ہے۔اسی منصوبہ کی دوسری کڑی ''مصادر تصوف'' پر وہ تاحیات کام کرتے رہے اور اس کی پہلی جلد کو انتقال سے کچھ عرصہ پہلے انسٹی ٹیوٹ کے ذمہ داران کے پاس روانہ کردیا تھا کہ وہ اس کی اشاعت کا انتظام کرسکیں۔مصادر تصوف پر مشتمل پہلی جلد ڈاکٹر غلام قادر لون اور پروفیسر مرحوم کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ اس کا پہلا مسودہ ڈاکٹر غلام قادر لون نے تیار کیا تھا جسے حذف واضافہ کے بعد پروفیسر مرحوم نے قابل اشاعت بنادیا تھا۔

مؤخر الذکر منصوبہ کے تحت مولانا آزاد لائبریری میں موجود عربی وفارسی کے مخطوطات کی فہرست تیار ہونی تھی۔اس منصوبہ کے تحت پہلی جلد میں عربی کے پانچ سو مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔اس منصوبہ کی پہلی جلد فہرس المخطوطات العربیۃ بجامعۃ علیگرہ الاسلامیۃ، الھند کے عنوان سے مؤسسۃ الفرقان للتراث الاسلامی ،لندن،۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء سے شائع ہوچکی ہے۔

اس بات کا افسوس کیا جاسکتا ہے کہ دونوں اہم علمی منصوبے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔اولیں ذکر منصوبہ کی تکمیل کی تو پھر بھی امید کی جاسکتی ہے لیکن مؤخر الذکر منصوبہ ٹھنڈے بستہ کی نذر ہوچکا ہے کہ کچھ انتظامی امور پر اتفاق نہ ہونے کی بنا پر اس منصوبہ کو ختم کردیا گیا ہے۔

بیرون ملک کے اسفار

پروفیسر صدیقیؒ کی علمی خدمات کے پیش نظر انھیں مقامی اور بین الاقوامی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں دعوت دی جاتی تھی۔انھوں نے ان دعوتوں پر لبیک کہتے ہوئے ہندوستان کے مختلف شہروں کے ساتھ ساتھ پاکستان، سعودیہ عربیہ، ترکی، قطر اور نیپال کے سفر کیے تھے۔خاص طور سے پاکستان کے انھوں نے متعدد اسفار کیے تھے۔ان اسفار کی کثرت کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کا گھر آنگن بن گیا تھا۔عمر کے آخری حصہ میں انھوں نے اپنے اسفار پاکستان کی دلچسپ روداد بھی مرتب کردی ہے جسے اشاعت پذیر ہونے میں اب نہ جانے کتنا عرصہ لگے گا۔

ان کے سفر پاکستان (فروری ۲۰۰۰ء) اور سفر نیپال (جولائی ۲۰۰۳ء) میں راقم ان کا ہم سفر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے علم وفضل، مقبولیت اور شہرت کا شاہد بھی ہے۔ان اسفار میں راقم کی جھولی میں بھی ان کے طفیل فیوض وبرکات کا حصہ آگیا تھا۔

اعزازات وانعامات

اللہ تبارک وتعالی نے انھیں ان کی علمی خدمات کے طفیل نہ صرف عزت وشہرت سے نوازا بلکہ انھیں اعزازات وانعامات سے بھی سرفراز کیا گیا۔اعزازات میں سب سے بڑا اعزاز ''نقوش ایوارڈ'' تھا جو انھیں ان کی عظیم الشان کتاب ''عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت'' پر دیا گیا تھا۔یہ کتاب ایک مقالہ کی شکل میں سب سے پہلے نقوش، لاہور کے رسول نمبر (جلد نمبر ۵) میں دسمبر ۱۹۸۳ء میں بغیر حواشی وتعلیقات کے شائع ہوئی تھی۔اسی مقالہ پر انھیں نقوش کا گرانقدر ایوارڈ (۱۹۸۴ء) دیا گیا تھا۔اس ایوارڈ کی اہمیت یوں اور بڑھ جاتی ہے کہ کسی ہندوستانی کو نقوش کا یہ ایوارڈ پہلی مرتبہ دیا گیا تھا۔اس ایوارڈ نے انھیں برصغیر ہندوپاک میں مشہور ومعروف کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔

بعد ازیں انھیں اس ایوارڈ سے ۱۹۹۸ء اور ۲۰۰۲ء میں بھی نوازا گیا تھا۔یہ دونوں ایوارڈس نقوش کے قرآن نمبر میں شائع ہونے والے مقالات پر دیے گئے تھے۔یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ نقوش ایوارڈ کی منتظمہ نے یہ طے کیا تھا کہ یہ ایوارڈ کسی کو دوبارہ نہیں دیا جائے گا لیکن غالبا مدیر نقوش جاوید طفیل صاحب مرحوم نے نقوش سے ان کی محبت،

قرآن نمبر کے تئیں ان کی محنت اور ان سے اپنی عقیدت کی وجہ سے اس اصول کو نظر انداز کر دیا تھا اور انھیں مزید دو بار اس ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا۔

اسلامی تاریخ نگاری میں ان کی خدمات کے پیش نظر ۲۰۰۵ء میں انھیں ''شاہ ولی اللہ ایوارڈ'' سے نوازا گیا تھا۔ یہ ایوارڈ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی کی جانب سے ہر سال کسی نہ کسی ماہر فن کو اس کی خدمات کے تئیں بطور اعتراف دیا جاتا ہے۔

اسی طرح ۲۰۱۳ء میں وزارت مذہبی امور، حکومت پاکستان کی جانب سے انھیں ''سیرت ایوارڈ'' سے بھی نوازا گیا تھا۔ یہ ایوارڈ ان کی کتاب ''عہد نبوی کا تمدن'' پر دیا گیا تھا۔ اس ایوارڈ کی خاص بات یہ ہے کہ پہلی مرتبہ اس سے کسی غیر ملکی اسکالر کو نوازا گیا تھا۔

تصانیف

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی علیہ الرحمہ نے ایک بامقصد زندگی گزاری اور حیات مستعار سے بھرپور اٹھایا تھا، زندگی کی رعنائیوں سے دل کھول کر لطف اٹھایا، اہل خانہ کے آرام وسکون کا خیال رکھا اور خاندانی روایات کو تاحیات نبھاتے رہے۔ انھوں نے اپنے اوقات کو تقسیم کر رکھا تھا اور اس پر عام طور پر عمل کرتے تھے کہ کام کے وقت کام اور سیر وتفریح کے وقت سیر وتفریح۔ اس اصول پر وہ تاحیات کاربند رہے جس کے نتیجہ میں انھوں نے مقالات وتصانیف کا ایک گرانقدر سرمایہ چھوڑا ہے۔

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی علیہ الرحمہ کی علمی خدمات کو پانچ بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱- سیرت نبوی اور اس کے متعلقات
۲- مطالعۂ شاہ ولی اللہ
۳- قرآنیات
۴- حدیث
۵- تاریخ

مذکورہ بالا تقسیم ان کی علمی خدمات کی کمیت وکیفیت کے پیش نظر کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز تو فن تاریخ سے کیا تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کے مطالعہ کا رخ سیرت نبوی کی طرف پھر گیا اور کچھ اس طرح پھرا کہ وہ عصر جدید میں برصغیر کے امام سیرت اور بابائے سیرت قرار دے دیے گئے۔ سیرت نبوی کے وسیع اور عمیق مطالعہ کے نتیجہ میں ان کے اشہب قلم سے نت نئے موضوعات کا انبار لگ گیا کہ ان کی علمی خدمات کا ستر فیصد سے زائد حصہ سیرت نبوی اور اس کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے اور اس کے نت نئے گوشوں اور اس کی مختلف جہات کو اجاگر کرتا ہے۔

ذیل میں ان کی تصانیف کی ایک فہرست باعتبار حروف تہجی پیش کی جارہی ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے انھوں نے کس قدر علمی سرمایہ اپنے پیچھے بطور یادگار چھوڑا ہے اور ان میں موضوعات کا کتنا تنوع پایا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ان کی مطبوعہ کتب کی فہرست میں حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کوئی کتاب چھوٹنے نہ پائے تاہم اس بات کا امکان پایا جاتا ہے کہ کچھ کتابوں کا ذکر رہ گیا ہو، خاص اللہ سے پاکستان میں شائع ہونے والی کتب صدیقیؒ۔

اسی طرح جن کتابوں کے صفحات کی تعداد کا ذکر کیا ہے یہ وہ تعداد صفحات ہے جن کا ذکر کتاب کی معلومات نشر کے ضمن میں کیا گیا ہے۔ اس بات کی وضاحت کی ضرورت اس لیے درپیش ہے کہ کئی ایک کتابوں میں فہرست مضامین، مقدمۂ مولف وغیرہ کے صفحات کی تعداد معلومات نشر میں مذکور نہیں ہیں۔

☆ امام الحسنین ﷺ کا سفر طائف، مرتبہ حافظ محمد گھانچی (جنوری ۲۰۲۰ء)

☆ اندلس میں علوم قرأت کا ارتقاء، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء، ۲۸۴ صفحات

☆ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے معاشرتی تعلقات

۱- ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۱ء، ۱۸۴ صفحات

۲- ادارۂ تحقیقات، کراچی، جمادی الثانی ۱۴۴۰ھ/ فروری ۲۰۱۹ء، ۱۸۴/صفحات

☆ تاریخ تہذیب اسلامی (چار حصے)، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، ۱۶۲ جوگا بائی مین روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵/ قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، بی-۳۵ حضرت نظام الدین (ویسٹ)، نئی دہلی-۱۱۰۰۱۳

حصہ اول: عہد جاہلی وعہد نبوی، ۲۳۹ر صفحات، اشاعت اول: ۱۹۹۴ء، اشاعت دوم: ۲۰۱۲ء، اشاعت سوم: ۲۰۱۸ء

صہ دوم: اسلامی خلافت، ۲۹۹ر صفحات، اشاعت اول: ۱۹۹۸ء، اشاعت دوم: ۲۰۱۲ء، اشاعت سوم: ۲۰۱۹ء

حصہ سوم: خلافت عباسی، اشاعت اول: ۲۰۱۲ء

حصہ چہارم: اندلس، شمالی افریقہ، صقلیہ، اشاعت اول: ۲۰۱۲ء [پہلی اور دوسری جلد کی اشاعت اول کے ناشر کا نام فاؤنڈیشن فار ایجوکیشنل ڈولپمنٹ، ۱۶۱-ایف جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵ مذکور ہے]

☆ تصانیف شاہ ولی اللہ-ایک تنقیدی تجزیہ، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۹ء، ۱۸۹ر صفحات

☆ (حضرت) ثویبہؓ-رسول اکرم کی رضاعی والدہ، اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی اشاعت اول: رجب المرجب ۱۴۳۰ھ/ جولائی ۲۰۰۹ء اشاعت ثانی: ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ/ فروری ۲۰۱۵ء

☆ جدید ہندوستان میں اردو سیرت نگاری-میزان نقد میں، کتب خانہ سیرت، اردو بازار، کراچی، ربیع الأول ۱۴۴۱ھ/ نومبر ۲۰۱۹ء، ۹۶ر صفحات

☆ حجة اللہ البالغة-ایک تجزیاتی مطالعہ (مجلّہ علوم اسلامیہ کی خاص اشاعت، مجموعۂ مقالات سیمینار، ۲۰-۲۲ر فروری ۲۰۰۱ء)، شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، مارچ ۲۰۰۲ء، ۳۳۷ر صفحات

☆ (حضرت) حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ، زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز، ناظم آباد نمبر ۴، کراچی، دسمبر ۲۰۱۸ء، ۱۵۱ر صفحات

☆ خطبات سیرت (مصادر سیرت کا تجزیاتی مطالعہ)، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ۲۳۳ر صفحات

☆ خطبات سرگودھا: سیرت نبوی ﷺ کا عہد مکی، مرتب پروفیسر عبدالرؤف ظفر، شعبۂ اسلامیہ، یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۶ء، ۳۰۴ر صفحات

☆ خلافت اموی، خلافت راشدہ کے پس منظر، ادارہ تحقیقات، کراچی (تین اشاعتیں بالترتیب: فروری ۲۰۱۰ء، جنوری ۲۰۱۳ء جنوری ۲۰۲۰ء)

☆ خلجی خاندان از کے ایس لال (انگریزی سے ترجمہ)

۱- ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ۴۱۲ر صفحات فکشن ہاؤس، مزنگ روڈ، لاہور، ۲۰۰۲ء، ۴۳۹ر صفحات

☆ رسول اکرم ﷺ اور خواتین- ایک سماجی مطالعہ، اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱ حوض سوئیوالان، نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲، ۲۰۰۶ء، ۲۱۹ر صفحات

☆ رسول اکرم کے صحابی حکیم حزام، اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱ حوض سوئیوالان، نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲، ۲۰۱۶ء، ۱۳۸ر صفحات (اشاعت اول)

غالباً یہی کتاب ''حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ، زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز، ناظم آباد نمبر ۴، کراچی، دسمبر ۲۰۱۸ء، ۱۵۱ر صفحات'' کے نام سے بھی شائع ہوئی ہے

☆ رسول اکرم ﷺ کی رضاعی مائیں، مکتبہ الفہیم، ریحان مارکیٹ، فرسٹ فلور، دھوبیا املی روڈ، صدر چوک، مئو ناتھ بھنجن، یوپی-۲۷۵۱۰۱، اپریل ۲۰۱۱ء، ۱۶۸ر صفحات

☆ سنتوں کا تنوع-ہر سنت افضل ہے، ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ب ت (مقدمہ مصنف پر ۲ر فروری ۲۰۰۷ء کی تاریخ درج ہے)

☆ سرسید اور علوم اسلامیہ (مجلّہ علوم اسلامیہ کا خصوصی شمارہ)، ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ- ۲۰۲۰۰۲، ۳۳۰ر صفحات

☆ سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز، ناظم آباد نمبر ۴، کراچی، دسمبر ۲۰۱۸ء، ۲۰۷ر صفحات

☆ سیرت ابن اسحاق میں مکی احادیث، مرتب حافظ محمد عارف گھانچی، کتب خانہ سیرت، اردو بازار، کراچی، ۲۰۲۰ء ۸۴ر صفحات

☆ سیرت نگاری-تعارف، مآخذ، رجحانات، منہج، مرتبہ حافظ محمد گھانچی، کتب خانہ سیرت، اردو بازار، کراچی، مارچ ۲۰۲۰ء (اشاعت اول)، ۲۴۶ر صفحات

☆ شاہ ولی اللہ کا رسالۂ سیرت: سرور المحزون فی ترجمۃ نور العیون، حضرت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت، ضلع مظفر نگر، یوپی، ۱۰-۱۱ر نومبر ۲۰۰۶ء (اشاعت اول)، ۲۴۰ر صفحات

☆ شاہ ولی اللہ کا فلسفۂ سیرت، شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۰۰ (اشاعت اول)، ۱۴۴ رصفحات

☆ شاہ ولی اللہؒ کی خدمات حدیث، حضرت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت، ضلع مظفر نگر، یوپی، ۱۰-۱۱ر دسمبر ۲۰۰۴ء، ۴۱۶ رصفحات

☆ شاہ ولی اللہ کی صوفیانہ شرح حدیث، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت، ضلع مظفر نگر، یوپی، ۱۴-۱۵ر نومبر ۲۰۰۸ء (اشاعت اول)، ۲۲۹ رصفحات

☆ شاہ ولی اللہ دہلوی کی قرآنی خدمات (سیمینار مقالات)، مرتبہ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی و پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۱۳ء، ۲۹۲ رصفحات

☆ شاہ ولی اللہ کے مآخذ-کتب وشخصیات، حضرت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت، ضلع مظفر نگر، یوپی، ۵ر مارچ ۲۰۱۰ء، ۲۶۴ رصفحات

☆ (حضرت) شاہ ولی اللہ دہلوی-شخصیت وحکمت کا ایک تعارف، شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، فروری ۲۰۰۱ء، (اشاعت اول)، ۴۸ رصفحات۔ اس کتاب کا انگریزی اور عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے

☆ عبدالمطلب ہاشمی رسول اکرم ﷺ کے دادا

۱- اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۷۸۱ احوض سوئیوالان، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲، ۲۰۰۴ء، ۱۲۰ رصفحات

۲- بہ اشتراک: انسٹی ٹیوٹ آف سیرت اسٹڈیز، بیت الحکمت، لاہور، دارالنوادر، لاہور، ۲۰۰۵ء، ۱۲۰ رصفحات

☆ عہد جدید میں خواتین کی سیرت نگاری-ایک تنقیدی مطالعہ، کتب خانہ سیرت، دوکان نمبر ۳۱۳، تیسری منزل، بک مال، اردو بازار، کراچی، محرم ۱۴۴۰ھ/ستمبر ۲۰۱۸ء، ۲۷ رصفحات

☆ عہد نبوی کا تمدن، اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۷۸۱ احوض سوئیوالان، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲، ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء (طباعت اول)، ۸۰۸ رصفحات

☆ عہد نبوی کا نظام حکومت

۱- ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲، ۱۹۹۴ء، ۱۳۶ رصفحات

۲- الفیصل، اردو بازار، لاہور، جون ۱۹۹۵ء، ۱۳۶ رصفحات

☆ عہد نبوی میں اختلافات-جہات، نوعیتیں اور حل

۱- انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، ۱۶۲ جوگا بائی مین روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵/ قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، بی-۳۵ حضرت نظام الدین (ویسٹ)، نئی دہلی-۱۱۰۰۱۳، ۲۰۱۳ء، ۲۴۶ رصفحات

۲- دارالنوادر، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۴ء، ۲۶۴ رصفحات

☆ عہد نبوی میں سیرت فاروقی، اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۷۸۱ احوض سوئیوالان، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲، ۲۰۱۵ء

☆ عہد نبوی میں کی تنظیم ریاست وحکومت

۱- قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، وپٹیچ بلڈنگ، حضرت نظام الدین (ویسٹ)، نئی دہلی-۱۱۰۰۱۳، ۱۹۹۸ء، ۴۹۷ رصفحات

۲- کتب خانہ سیرت، اردو بازار، کراچی، ذی القعدہ ۱۴۴۰ھ/ جولائی ۲۰۱۹ء، ۵۲۷ رصفحات

☆ عہد نبوی میں قریش وثقیف کے تعلقات، مسند سیرت وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی، گلشن اقبال کیمپس، کراچی، جون ۲۰۱۵ء، ۳۰۴ رصفحات

☆ غزوات نبوی کی اقتصادی جہات

۱- ادارہ مطالعات اسلامی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۹ء، ۲۰۰ رصفحات

۲- غزوات نبوی کے اقتصادی پہلو المعروف غزوات نبوی کی اقتصادی جہات، مشتاق بک کارنر، اردو بازار، لاہور، ب ت، ۲۲۴ رصفحات

☆ الفاروق-ایک مطالعہ، مرتبہ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی وڈاکٹر عبیداللہ فہد (مجلّہ علوم اسلامیہ کی خصوصی اشاعت، مقالات سیمینار ۱۸-۱۹ر نومبر ۲۰۰۱ء)، ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، مارچ ۲۰۰۲ء، ۴۴۰ رصفحات

☆ فکر اسلامی کی تشکیل جدید-سیرت نبوی کے تناظر میں، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی (انتیسواں مجیب میموریل لیکچر ۲۰۱۵ء)، ب ت (رسالہ کی پشت پر ۲۷ر اکتوبر ۲۰۱۵ء درج ہے)

☆ مصادر سیرت نبوی (دوجلدیں)

۱- انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، ۱۶۲ جوگا بائی مین روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵/ قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، بی-۳۵ حضرت نظام الدین (ویسٹ)، نئی دہلی-۱۱۰۰۱۳، ۲۰۱۶ء، ۶۳۸ رصفحات (حصہ اول)، ۶۶۶ رصفحات (حصہ دوم)

۲- دارالنوادر، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۶ء، ۶۳۸ رصفحات (حصہ اول)، ۶۶۶ رصفحات (حصہ دوم)

☆ معاش نبوی، رسول اکرم ﷺ کے ذرائع آمدن کا تحقیقی جائزہ، کتب خانہ سیرت، لی مارکیٹ، کراچی، ۲۰۱۵ء (اشاعت اول)، ۲۱۷/صفحات

☆ مقالات سیرت، مرتب ڈاکٹر محمد ہمایوں شمس، مکتبہ اسلامیہ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۵ء ۵۲۸/صفحات (جلد اول)

☆ مقالات سیرت، مرتب ڈاکٹر محمد ہمایوں شمس، مکتبہ اسلامیہ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۵ء ۵۴۴/صفحات (جلد دوم)

☆ مقالات سیرت، مرتب ڈاکٹر محمد ہمایوں شمس، مکتبہ اسلامیہ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۶ء ۴۸۰/صفحات (جلد سوم)

☆ مکی اسوۂ نبوی-مسلم اقلیتوں کے مسائل کا حل

۱- اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱ حوض سوئیوالان، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲، اپریل ۲۰۰۵ء (طبع اول)، ۳۲۷/صفحات

۲- اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی (ادارہ معارف اسلامی، کراچی)، محرم الحرام ۱۴۳۲ھ/ دسمبر ۲۰۱۰ء ۳۲۵/صفحات اور ۱۶/ صفحات (برائے مقدمہ، فہرست وغیرہ)

☆ مکی عہد میں اسلامی احکام کا ارتقاء

۱- قرآن اکیڈمی، صفا شریعت کالج، ڈومریا گنج، ضلع سدھارتھ نگر، یوپی، ۲۰۰۷ء، ۶۰۰/صفحات

۲- نشریات، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۸ء، ۵۹۸/صفحات

☆ وحی حدیث، اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱ حوض سوئیوالان، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲، اپریل ۲۰۰۴ء (طبع اول)، ۲۸۰/صفحات

عربی کتب

☆ الامام الشاه ولى الله الدهلوى–عرض موجز لحياته وفكره، ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۱ء

☆ فهرس المخطوطات العربيه بجامعة عليگره الاسلامية، الهند، المجلد الأول، اعداد: محمد ياسين مظهر صديقى، تحرير: قاسم السّامرائى، مؤسسة الفرقان للتراث الاسلامى، لندن، ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء، ۶۰۳/صفحات، مقدمہ مرتب: ۱۴/صفحات

☆ قضايا كتابة التاريخ الاسلامي وحلولها

۱- جامعہ سلفیہ، وارانسی، ۱۹۸۹ء ۲- ۱۹۹۱ء دبئی

☆ الهجمات المغرضة على التاريخ الاسلامى، دار الصحوة، القاهرة، ۱۹۸۸ء

English Books

How the Prophet Muhammad(peace be upon him)Earned and Spent Money? A Critical Study, Translator: Abdur Raheem Kidwai, Editor: Abdul Kader Choughley, Ahsan Academy of Research, South Africa,2019, 125 Pages

Organisation of Government Under the Prophet, Idarah-I Adabiyat-I Delhi, Qasimjan Street, Delhi. 1987

Shah Waliullah Dehlavi: An introduction to his illustrious Personality and Achievements, Translator: Abdur Raheem Kidwai, Shah Waliullah Dehlavi Research Cell, Institute of Islamic Studies, Aligarh Muslim University, Aligarh. 2001

The Prophet Muhammad A role Model for Muslim Minorities, Translator: Abdur Raheem Kidwai, The Islamic Foundation, leicetershire, UK, 2006

مذکورہ بالا کتب کے علاوہ سینکڑوں کی تعداد میں ان کے علمی مقالات بھی شائع ہو چکے ہیں جن میں سے بعض مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ کافی طویل مقالات ہیں۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق ان کے مقالات کو اگر کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا تو وہ کم از کم دس ضخیم جلد پر مشتمل ہوں گے اور ہر جلد چار سو سے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہو گی۔

وفات

جوش، ولولہ اور عمل پیہم کے ساتھ ایک طویل زندگی گزارنے کے بعد پروفیسر صدیقیؒ جیسا نیر تاباں بالآخر ۱۵/ستمبر ۲۰۲۰ء کو غروب ہو گیا تاہم شفق پر اپنی سرخیاں بکھیر گیا ہے اور اپنے پیچھے تصانیف و مقالات کا ایک گرانقدر سرمایہ بطور یادگار چھوڑ گیا جس سے آنے والی نسلیں ان شاء اللہ فائدہ اٹھاتی رہیں گی۔

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

تعارف وتبصرہ: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی
نام کتاب : اہل کتاب اور مسئلہ کفر وایمان (ایک تحقیقی وتنقیدی جائزہ)
مصنف : مولانا محمد غزالی ندویؒ
صفحات : ۵۱۲
قیمت : ۴۷۵
ناشر : امام بخاری ریسرچ اکیڈمی علی گڑھ
ملنے کا پتے: امام بخاری ریسرچ اکیڈمی علی گڑھ، پاریکھ بکڈپو لکھنؤ، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

زیر نظر کتاب فاضل مصنفؒ کی پانچ سالہ کی کدّ وکاوش، فکر وتدبر، بحث وتحقیق کا نتیجہ اور وسیع وعمیق مطالعہ کا نچوڑ ہے، اس کتاب کی تصنیف میں مصنف کا مخلصانہ جذبہ اور غیر معمولی حمیتِ دینی کا بڑا کردار ہے، خالص علمی رنگ میں موضوع کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے، مضبوط علمی اور استدلالی اسلوب اختیار کیا گیا ہے، کتاب کی عبارتیں متانت وسنجیدگی کا مظہر ہیں، خالص علمی موضوع ہونے کے باوجود طرز نگارش انتہائی پرکشش ہے، یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ کتاب مذکور میں موضوع سے متعلق موسوعی مواد موجود ہے، یہ کتاب منہجیت ومعروضیت اور تنقیدی جائزہ کی بہترین مثال ہے، مصنفؒ عربی انگریزی اور اردو پر یکساں دسترس رکھتے تھے اس لیے اس کتاب میں اس موضوع سے متعلق تینوں زبانوں کے لٹریچر کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے اور فیصلہ کن بحث پیش کی گئی ہے، اس کتاب کی تصنیف کے دوران مصنف عزیزؒ کا جذبہ قابل رشک تھا، ان کی غیرت دینی لائق دید تھی، یہ ان کی پہلی باقاعدہ تصنیف (افسوس کہ تقدیر میں یہی آخری بھی تھی) ہے، لیکن فنی وتکنیکی باریکیوں پر نظر رکھنے والے نیز تصنیفی دنیا کے ناموران بھی اس کتاب کو پڑھ کر مصنف کی پختہ استعداد، سلیقۂ تصنیف، معیارِ تحقیق اور اسلوب کی متانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکیں گے، مقدر یہی تھا کہ جواں سال مصنف کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد کتاب منظر عام پر آئے سو تمام تر تگ ودو کے باوجود یہی ہوا۔

مسلمان ہونے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان اور آپ کا اتباع شرط ہے، صدر اول سے امت مسلمہ کا یہ متفقہ عقیدہ رہا ہے کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہوسکتا جو محمدؐ پر اور آپؐ پر اتارے گئے قرآن پر ایمان نہ لے آئے، قرآن مجید نے بار بار اس عقیدہ کی صراحت کی ہے تورات وانجیل کے متبعین کو اہل کتاب کہہ کر مخاطب کیا ہے، ان کے کفر کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس طرح بیان کیا ہے اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی، لیکن استعمار واستشراق نے امت میں متعدد فتنوں کو جنم دیا، تشکیکی مزاج کو فروغ دیا، خود مسلمانوں میں مستشرق پیدا کردیے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کے درمیان اہل کتاب کے کفر کا وہ موضوع زیر بحث بن گیا جس پر قرآن کے بیانات اتنے واضح اور صریح ہیں کہ انھیں پڑھنے کے بعد پھر کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی، لیکن جب اسلامیات کا مطالعہ کرنے والوں کا تمام تر مرجع ہی مستشرقین کا لٹریچر قرار پایا تو اس طرح کے شکوک وشبہات میں الجھنا اور پھر ان کا وکیل بن جانا کوئی بعید از عقل بات نہیں، ہماری یونیورسٹیوں کا المیہ یہ ہے کہ وہاں کے شعبہ اسلامیات میں مستشرقین کی زہر میں بجھی ہوئی تحریروں کو مرجعیت واستناد کا درجہ ملا ہوا ہے، مستشرقین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے خود مسلمانوں میں اور ان کے تعلیمی اداروں میں اپنے جانشین پیدا کردیے، جنھوں نے ان کے افکار کو اوڑھ کر ان کی ترویج واشاعت کو اپنا مقصد زندگی بنالیا، چنانچہ آپ جائزہ لے سکتے ہیں کہ جو کام کسی زمانے میں خود مستشرقین کیا کرتے تھے وہی کام عہد حاضر میں ہماری صفوں میں

موجود ان کے فکری وارثین کر رہے ہیں، مصنف علام کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اس سلسلہ میں مغربی سامراج کے تسلط اور مغربی تہذیب کی بالادستی کا بڑا کردار ہے، جب کسی قوم کو سیاسی، عسکری بالادستی حاصل ہوتی ہے تو لازمی طور پر بہت سی اقوام کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں، جس کے نتیجہ میں فاتح اقوام کی تہذیب اور افکار ونظریات کو بھی بالادستی حاصل ہوجاتی ہے، چند برس قبل تک یہ بات باغیرت اہل علم ہی سمجھ سکتے تھے لیکن ادھر چند ماہ کے دوران مسلم ممالک کے اقدامات سے اس عقدہ کو سمجھنا قطعاً مشکل نہیں رہ گیا ہے، آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کی اسلام دشمنی کو فروغ دینے اور اس کے لیے ہر طرح کا تعاون پیش کرنے کی ایک مثال فرانس کا حالیہ ملعون عمل اور اس پر سعودی عرب اور اس کے ہمنوا دیگر ممالک کا ردعمل ہے، ذہنی شکست خوردگی سے محفوظ رہنا، فاتح قوم سے مرعوب نہ ہونا، فکری بنیادوں پر سمجھوتہ نہ کرنا، ''کلمۃ سواء'' کی حقیقت وحدود کو سمجھنا اور پھر دوٹوک انداز میں یہ اعلان کر دینا سب کے بس کی بات نہیں کہ ؎

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

برصغیر میں بھی مستشرقین کی وراثت منتقل ہوئی، ان کے ملغوبہ پر دانشوری اور تحقیق کی نئی نئی عمارتیں تعمیر کی گئیں، زوالِ امت کے اسباب کا پتہ لگانے کی دُھن میں زوال ایمان کے بھی سامان فراہم کیے گئے، مسلّمہ عقائد اور قرآنی صراحتوں کو بھی کنارے لگا دیا گیا، آیات قرآنیہ کی ایسی ایسی تاویلیں کی گئیں کہ پندرہ صدیوں پر محیط تاریخ علم تفسیر میں اس کی نظیر نہیں ملتی، تفصیلات سے قطع نظر اسی سلسلہ کی ایک کڑی ڈاکٹر راشد شاز ہیں جنھوں نے اپنی متعدد تصنیفات میں مستشرقین کے اعتراضات کو دوہرایا ہے، مسلم یونیورسٹی میں جب برج کورس کا آغاز ہوا اور شاز صاحب اس کے ڈائریکٹر بنائے گئے تو ان کو اپنے افکار کی ترسیل کا ایک نیا پلیٹ فارم مل گیا، جس طرح مسلم یونیورسٹی میں تقرری سے ان کی شخصیت کو ایک نئی جہت مل گئی، انھوں نے مدارس کے نو فارغین کو تختۂ مشق بنانا شروع کر دیا، اس کے نتائج تیزی کے ساتھ سوشل میڈیا کی زینت بننے لگے، لوگ ان کی کتابوں کی طرف متوجہ ہوئے کچھ بندگان خدا نے اس نئے طوفان کا رخ موڑنے کی ٹھان لی، مولانا محمد غزالی ندوی کے اس سلسلہ میں کئی مضامین ''ندائے اعتدال'' کے صفحات کی زینت بنے، انھوں نے شاز صاحب کی کتب کا تنقیدی مطالعہ کیا، بالآخر انھوں نے زیر نظر موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا، جو انتہائی محقق و مدلل اور عہد جدید کے اسلوب ومعیار کے عین مطابق اب سامنے آسکی ہے، اس کتاب کی تصنیف کا خلفیہ اگرچہ یہی ہے اور بالخصوص اس میں جناب شاز کے آراء وافکار کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے لیکن سچ پوچھیے تو اب یہ کتاب اس موضوع کا انسائیکلو پیڈیا ہے، اس میں اس موضوع کے مالہ وماعلیہ اور تمام متعلقات واعتراضات کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے، نہایت متانت ومنطقیت کے ساتھ موضوع کے ہر ہر پہلو سے بحث کی گئی ہے اور اصل مدعا کو قرآن مجید سے ثابت کیا گیا ہے، پھر حدیث اور سلف کی تصریحات سے بھی دلائل نقل کیے گئے ہیں۔

کتاب کو نو فصلوں میں منقسم کیا گیا ہے پہلی فصل میں ''موضوع کا تعارف اور اس کی اہمیت'' ہے، دوسری فصل میں ''اہل کتاب کے کفر کے اسباب'' پر روشنی ڈالی گئی ہے، تیسری فصل میں ''موجودہ اہل کتاب کے کفر کے دلائل'' پر دلائل کو جمع کیا گیا ہے، قرآن مجید سے ۳۸ اور حدیث نبوی سے ۱۰ دلیلیں نقل کی گئی ہیں، چوتھی فصل میں علمائے متقدمین ومتاخرین کے اقوال وتصریحات کو نقل کیا گیا ہے، پانچویں فصل میں ''موجودہ اہل کتاب کو مومن کہنے والوں پر ایک نظر'' ڈالی گئی ہے، ان کے وعدوں کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے، ان کے شبہات ونظریہ کا بھرپور علمی جائزہ لیا گیا ہے، چھٹی فصل میں ''توریت وانجیل کی حجیت'' کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، نہایت عالمانہ انداز میں ان کی استنادی حیثیت پر گفتگو کی

گئی ہے اوران کے اندر موجود اغلاط وتضادات وتناقضات اوران میں ہوئی تحریفات کو واضح کرتے ہوئے یہ ثابت کردیا گیا ہے کہ ان تحریفات وتناقضات کے اعتراف کے بعد ان پر عمل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، ساتویں فصل میں یہودی اور عیسائی مصنّفین کی ان کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو انھوں نے اہل کتاب کو قرآن سے مومن ثابت کرنے کے لیے کی ہیں، آٹھویں اورنویں فصل اس کتاب کا خلاصہ ہے، جس میں مصنف کی علمیت، بصیرت اور نقد واستدراک کی اعلیٰ ترین استعداد نکھر کر سامنے آتی ہے، آٹھویں فصل میں مصنف نے تفصیل سے ان حضرات کے دلائل کا جائزہ لیا ہے جو کھینچ تان کر اہل کتاب کو مومن ثابت کرتے ہیں، مصنف نے ان دلائل کے تنقیدی جائزے پر اکتفا نہ کرتے ہوئے ان کے نہایت عالمانہ اور تسلی بخش جوابات بھی تحریر کردیے ہیں، نویں فصل اہل کتاب کے کفر و ایمان سے متعلق مغالطوں اوران کے ازالہ پر مشتمل ہے، کبھی غلط فہمی مغالطہ کا سبب بنتی ہے کبھی کج فہمی، کبھی علمی ناپختگی کے سبب انسان مغالطہ میں پڑ جاتا ہے اور کبھی دلائل کی قلت یا دلائل کا فقدان کھینچ تان کرنے اور مغالطہ انگیزی پر مجبور کرتا ہے، کبھی انسان کسی مشن کی تکمیل کے لیے اپنی کاریگری سے مغالطے تیار کرتا ہے، اہل کتاب کے کفر وایمان کے سلسلہ میں ہر قسم کے مغالطے موجود ہیں، مصنف رحمہ اللہ نے تقریباً ۲۸ مغالطوں کو واضح کیا ہے، ضمناً اور بھی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگیا ہے، کتاب کی سطر سطر سے مصنف کی بصیرت، فکر کی پختگی، تحقیق پر اعتماد، موضوع پر کامل دسترس اور اپنے دلائل پر اطمینان وشرح صدر کا اظہار ہوتا ہے، پوری کتاب پڑھ جایئے کوئی ایک مقام بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جہاں عبارت گول مول ہو، پیچیدگی ہو، گنجلک ہو یا فلسفیانہ موشگافیوں کا سہارا لیا گیا ہو، یا عہد جدید کے بعض دانشوروں کی طرح بات گھما پھرا کر کہی گئی ہو، ظاہر ہے کہ ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب اپنی فکر وتحقیق پر اپنا ہی ضمیر راضی نہ ہو، یا فکری بنیادیں کمزور ہوں، یا دلائل پورے طور پر منکشف نہ ہوں، یا کھینچ تان مقصود ہو، مصنف رحمہ اللہ اس لحاظ سے مکمل طور پر بری ہیں، یہی وجہ ہے کہ کتاب وضوح وبیان کی خوبی سے لبریز ہے، پختہ دلائل کا انبار ہے، متانت وشرافت، اعتدال وتوازن، احترام وشائستگی اور اصول تحقیق کی بھرپور رعایت سے کتاب عالمانہ وقار کی حامل بن گئی ہے، کتاب کی معروضیت اور استدلالی طرز نگارش ہمارے اس مذہبی حلقہ کے لیے لائق نمونہ ہے جس کو صرف مجادلانہ رنگ، مناظرانہ اسلوب، تضحیک آمیز رویّہ، تنقیص وتفسیق، الزام تراشی اور تحریر کی شدت وحدت سے ہی تسکین حاصل ہوتی ہے حالانکہ اس کا فائدہ نہایت محدود ہوتا ہے، جبکہ ممدوح گرامیؒ کے اختیار کردہ اسلوب کا نفع عام وتام ہوتا ہے بلکہ اس اسلوب کے اثرات کا دائرہ نہایت وسیع ہوتا ہے۔

ناچیز راقم کو یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ کتاب شبلی و سلیمان کی ڈالی ہوئی طرح کا حسین امتداد ہے، بحث وتحقیق، علمیت ومعروضیت اور شرافتِ قلم کے ساتھ دینی غیرت و حمیت کا بہترین نمونہ ہے، مجھے قوی امید ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر مرجع کی حیثیت حاصل کرے گی، گرچہ اس کی اشاعت صدیق مکرمؒ کی حیات مستعار میں نہ ہوسکی مگر یہی کتاب ان شاء اللہ انھیں تاریخ میں زندہ جاوید بنانے کا کام کرے گی، ہمارے دور کا یہ المیہ ہے کہ کتاب پر مصنف کا نام دیکھ کر ہی کتاب لی جاتی ہے اور مطالعہ کیا جاتا ہے، اس روش سے ہٹ کر دیکھا جائے تو یہ کتاب خود اچھے اچھے اہل علم کے لیے لائق مطالعہ اور قابل استفادہ ہے، اہل علم کے حلقہ میں اس کی دھوم ہونی چاہیے اور عہد حاضر کی تشکیکی تحریک کا بھرپور تعاقب کرنیوالی اس شاندار مدلل ومُسکت کتاب کا بھرپور استقبال ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہیکہ اس کتاب کے نفع کو عام وتام فرمائے اور حضرت مصنفؒ کی قبر کو اپنے انوار سے منور فرمائے۔

☆☆☆

تعارف وتبصرہ: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی
نام کتاب : قرآنی سفر
مولف : سید احمد انیس ندوی
صفحات : ۳۵۰
قیمت : ۱۸۰
ناشر وتقسیم کار: اسلامک سینٹر، مدینہ کالونی، فیروز آباد

زیر نظر کتاب ''قرآنی سفر'' صلاح وصلاحیت کے حامل ایک فاضل ندوی کی خدمتِ قرآنی بلکہ قرآن مجید سے ان کے شغف کا ایک قابل قدر وقابل رشک نمونہ ہے، سچ پوچھیے تو یہ کتاب ''فضلائے ندوہ کی قرآنی خدمات'' میں ایک اہم اضافہ ہے، امت کو بلکہ بنی نوعِ انسان کو قرآن مجید سے جوڑنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے، خالق ومخلوق کے درمیان حائل پردوں کو چاک کر کے مخلوق کے لیے کلام الٰہی کے ذریعہ براہ راست معرفت خالق کے حصول کی راہ ہموار کرنے کی سعی مبارک ہے، اس کاوش پر عزیز القدر برادرم انیس ندوی کو جس قدر مبارکباد دی جائے کم ہے، میں ان کو بہت قریب سے تو نہیں جانتا، لیکن جس قدر جانتا ہوں اس کے پیش نظر یہ انداز ہوتا ہے کہ وہ باتوفیق و با فیض نوجوان ہیں، ان سے شناسائی رابطۂ عامہ کے ذرائع سے ہوئی، پھر اچانک انھوں نے اپنے ایک رسالہ پر مقدمہ لکھنے کا مطالبہ کر دیا، اس رسالہ سے ان کے علمی ذوق اور مطالعۂ قرآن کا اندازہ ہوا، جلد ہی یہ شناسائی بردرانہ تعلق میں تبدیل ہوگئی حالانکہ اب بھی شاید ان سے صرف اور ملاقاتیں ہوئی ہیں وہ بھی بہت مختصر۔

یوں تو کلام الٰہی کو مخلوق تک پہنچانے والی ہر کوشش مبارک، اس کے پیغام کی ترسیل سے متعلق ہر عمل قابل قدر، لیکن اگر کوئی نوجوان اپنی عملی زندگی کے آغاز میں ہی قرآن کو مرجع بنالے، اسی کو اپنے غور وفکر کا محور بنالے اور اس کے مضامین وپیغام کو عام انسانوں تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی اٹھالے تو یہ مزید مبارک ولائق قدر اور قابل تحسین عمل ہے، اس پر مستزاد یہ کہ اگر اسلوب میں مخاطب و زمانہ کی رعایت ہو، لوگوں کو مضامین قرآن سے جوڑنے کا جذبہ کار فرما ہو تو مزید لائق ستائش ہے، اس لیے کہ آج عملی طور پر امت میں ہر چیز کی قدر و قیمت ہے سوائے قرآن کے، فضائل کی تبلیغ، مسائل کی تعلیم، ملفوظات کی ترویج، اصلاحی مضامین کی اشاعت اور اسی قبیل کی تمام تر اقسام پر توجہ ہے مگر کتاب الٰہی جو ان سب سے زیادہ توجہ کی مستحق تھی اس سے بے اعتنائی ہے، حالانکہ وہ انذار وتبشیر، تبلیغ وتلقین، ترغیب وترہیب وتذکیر، فضائل ومسائل کی جامع ہے، وہ دستور زندگی اور اساس نجات ہے، اصلاح کا اس سے بہتر ومکمل نسخہ دنیا میں متعارف ہوا ہی نہیں، اسی کتاب سے انقلاب آیا اور اسی کتاب سے دوبارہ آئے گا جب بھی آئے، حد تو یہ ہے کہ ہمارے مدارس میں اس کتاب کو وہ مقام نہیں دیا گیا جو اس کا حق تھا، کیا وجہ ہے کہ ایک شیخ التفسیر کو لوگ جانتے بھی نہیں جبکہ ایک شیخ الحدیث کی تعظیم وتکریم میں قلابے ملائے جاتے ہیں بلکہ اس منصب کا حصول کسی معجزہ سے کم نہیں سمجھا جاتا، اس کے لیے کیا کچھ نہیں ہوتا اور خدا جرأت کے ساتھ مجھے کہنے دیجئے کہ ہمارے یہاں قرآن کی تدریس وتعلیم میں اس کو طرح مقید کر دیا جاتا ہے کہ کلام الٰہی کا اصل خطاب اور خطاب کا ماحصل اذہان سے ماوراء ہوجاتا ہے، صورت حال یہ ہے کہ بیشتر اہل علم سے بات کیجئے تو محسوس ہوتا ہے کہ شریعت کے مصدر اول قرآن مجید سے انھیں دور دور کا واسطہ ہی نہیں، بلکہ بسا اوقات یہ تجربہ ہوا کہ دوران گفتگو کلام الٰہی پیش کیا گیا تو ان کی حیرت واستعجاب کی انتہا نہ رہی، ستم بالائے ستم یہ کہ وہ خطابِ قرآن کو عطا کی جانے والی اطلاقیت کو اسباب نزول کی روایات میں محدود کرتے نظر آئے، اس میں کلام نہیں کہ تفقہ فی الدین کا مطالبہ معدود ومحدود جماعت سے ہے لیکن ولقد یسرنا القران للذکر فہل من مدکر کا مدعا و مطالبہ عام ہے، اس کے لیے تگ ودو مبارک ہے، میدان تصنیف و تالیف کے نو وارد نوجوان کو اس قابل قدر کارنامہ پر داد وتحسین سے نوازا جانا اس کا حق ہے، کیونکہ اس نے ایک ایسے دور میں لوگوں کو قرآن سے جوڑنے کا عزم کیا جب کہ اہل علم بھی قرآن سے دور ہوگئے، آج ہمارے فکر ومطالعہ کی انتہا سو پچاس سال میں تصنیف ہونے والی کتب ہیں، چہ جائیکہ کتاب اللہ سے ہماری ابتدا ہوتی،

سنت نبوی سے ہم صحیح فہم حاصل کرتے، قرآن مجید کے اولین طلبہ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین) سے ہم فہم دین ومزاج شریعت سیکھتے اور پھر ائمہ مجتہدین کی کوششوں کے نتیجہ میں اپنی منزلیں طے کرتے، لیکن بہ قسمتی سے ہماری ترتیب الٹ گئی، (معاف کیجئے یہ تلخ حقیقت ہے مگر یہی عملی سچائی ہے) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزاجِ شریعت نظروں سے اوجھل ہوگیا، صحابہ کرام کا فہم ومنہج مطمح نظر نہ رہا، مقاصدِ شریعت سے گویا تعلق ہی نہ رہ گیا، تنگنائیوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا، انتشار کی نئی نئی شکلیں پیدا ہونے لگیں، افضل ومفضول اور راجح ومرجوح کے مباحث کفر وضلال اور حق وباطل کی کشمکش کا رنگ اختیار کرگئے، ایک مسلک پر دوسرے مسلک کی ترجیح منتہائے فہم اور مبلغ علم قرار پائی، لوگ مسالک، جماعتوں اور اداروں کی نسبت سے تقسیم ہوتے رہے حتی کہ وہ وقت آیا جب شخصیات کا نام لے کر تقسیم ہونے لگے، امت دولخت ودونیم ہی نہیں لخت لخت ہوگئی، اس تنگ دلی، تنگ نظری، جاہلانہ عصبیات، مسلکی، گروہی، جماعتی، نظریاتی، کتابی اور فکری تعصّبات کی مصیبت سے بچنے کا صرف وہی راستہ ہے جسے حضرت شیخ الہندؒ نے طویل غور وتدبر کے بعد تجویز کیا تھا کہ امت کو کلام الٰہی سے جوڑ دیا جائے، امت میں قرآن مجید کو عام کردیا جائے، کیونکہ یہی وہ کتاب ہے جو امت کو ایک نقطۂ اتحاد پر جمع کرسکتی اور امت کے شیرازے کو انتشار سے محفوظ کرسکتی ہے، کہنے کو تو یہ ایک جملہ تھا شیخ الہند کا، مگر اس کے پیچھے فکر ونظر کا ایک سیلاب اور ایک زبردست انقلاب تھا لیکن تقدیر الٰہی میں شیخ الہند کے لیے اس کی عملی تشریح مقدر ہی نہ تھی چنانچہ اسیری سے رہائی کے بعد ان کو موت نے وقت ہی نہ دیا، اور پھر بعد میں تو حضرت شیخ الہند کی فکر کو ان ہی کے حلقہ سے حلقہ بدر کردیا گیا جس کی تفصیل بڑی تکلیف دہ ہے، خدا کا شکر ہے کہ اسی جذبہ کے تحت آج ایک نوجوان نے قرآن مجید کے تیس پاروں کے منتخب مضامین کو ملخص کرکے عوام تک پہنچانے کی سعی مشکور کی ہے، دورِ آخر کی مصروف ترین زندگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس طرز پر متعدد لوگوں نے اس طرح کا کام کیا ہے اور سب اپنی اپنی جگہ نافع ثابت ہوئے ہیں، یہ کام بھی انشاء اللہ نفع بخش ہوگا اور اس کو دوام حاصل ہوگا۔

مصنف جواں سال ہیں، قرآن مجید سے شغف کے ابتدائی مراحل میں ہیں (ہم جیسے شخص کے لیے قابل رشک ہیں جسے اس ابتدائی مرحلہ سے بھی آشنائی نہیں) تاہم جو اٹھان ہے اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اگلے مراحل بھی طے کریں گے، موضوعیت ومنہجیت اور علمی مبادیات کا لحاظ آتے آتے آتا ہے، معاشرہ میں رواج پا گئی چیزوں سے دامن بچا پانا آسان نہیں ہوتا، علمی ودینی حلقوں میں بھی فرقہ واریت کا رنگ دیکھنے کو مل جاتا ہے، اس سے بچ پانا یا حق کا اظہار کرنا بڑی علمی جرأت کا کام ہے، تاہم برادرم انیس نے بڑی تک نباہنے کی کوشش کی ہے لیکن اپنے دیباچہ میں بعض سنی سنائی چیزوں کو محض دوسروں پر اعتماد کرتے ہوئے نقل کرنے سے گریز نہ کرسکے ہیں، حالانکہ جب تک خود تحقیق وتفکیر نہ ہو تب تک کسی رائے سے اتفاق واختلاف درست علمی رویّہ نہیں، قرآن مجید کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب تک درمیان سے سارے وسائل کو ہٹا کر (سوائے ان مقامات کے جہاں تفاسیر کی طرف رجوع ناگزیر ہو) بار بار اس پر تدبر کرنے کی صلاحیت نہ پیدا ہو جائے تب تک نہ اس کے اسرار کھلتے ہیں، نہ اس کی روح تک رسائی ممکن ہوتی ہے اور نہ ہی معاصر مسائل میں اس سے رہنمائیاں حاصل کرنے کا وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جسے خود قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے، اس جانب مولانا علی میاںؒ نے نہ صرف اشارہ کیا ہے بلکہ خود وہ بھی اس پر عمل پیرا رہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا کے تفسیری منہج پر کسی تفسیری ذوق کا رنگ نہیں چڑھا، قرآن مجید کی آیات سے امت کے لیے پیغام تلاشنا اور مختلف مسائل میں قرآن کی رہنمائی پیش کرنا ان کا وصف خاص رہا۔

منتخب مضامین کو پیش کرنے میں فاضل مولف بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں، انھوں نے موثر اور واضح عناوین قائم کیے ہیں، پھر ان عناوین کے تحت متعدد آیات میں وارد مضمون کو متعدد تفاسیر اخذ کرکے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے، اختصار و

جامعیت اور سلامت فکر وطبع پوری کتاب سے ظاہر ہے، ہر پارہ سے انھوں نے بارہ پندرہ مضامین کا انتخاب کیا ہے، البتہ اضافتوں کے استعمال سے بسا اوقات عناوین طویل ہوگئے ہیں اور عبارتوں میں بھی کشش باقی نہ رہی ہے، ساتھ ہی بسا اوقات بلکہ دیباچہ وغیرہ کے اسلوب نگارش میں علمی رنگ کی کمی محسوس ہوتی ہے، لیکن بحیثیت مجموعی مجھے یہ کہنے میں کچھ باک نہیں کہ وہ بڑی ہنرمندی کے ساتھ قرآن مجید کے منتخب واہم مضامین کو اردو میں پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں، حالانکہ اگر وہ اس کتاب پر نظر ثانی کریں اور اس کو پورے قرآن کا خلاصہ بنا دیں تو ضخامت میں بھی کوئی خاص اضافہ نہ ہوگا اور کام بھی مکمل ہوگا کیونکہ ابھی یک گونہ تشنگی کا احساس ہے، قرآن مجید کی ہر آیت اہم ہے، اس کے اندر بے شمار معانی کا دریا موجزن ہے، اہل نظر ایک ایک آیت سے سینکڑوں استنباطات کرتے ہیں، اس لیے خواہش وکوشش یہ ہونا چاہیے کہ ہر آیت انسانوں تک پہنچادی جائے۔ کبھی قرآن ایک مضمون ایک آیت میں سمیٹ دیتا ہے کبھی دو تین آیت کبھی ایک رکوع کبھی کچھ کم اور کبھی کچھ بیش ہیں، کیا خوب ہو کہ وہ ان مضامین کے اعتبار سے عنوان قائم کریں اور پھر ان کا خلاصہ پیش کردیں، اس کا نمونہ بھی موجود ہے اور خود فاضل مصنف نے بھی بڑی حد تک اس کتاب میں یہ کام کیا بھی ہے۔

مختصراً یہ کتاب عزیزم انیس زادہ اللہ علما وشرفا کی فاضلانہ تفسیری کاوش ہے، اختصار و جامعیت اس کا امتیاز ہے، آسان زبان، قابل فہم تلخیص اور جذبۂ صادق اس کتاب کی خوبصورتی ہے، رجوع الی القرآن اس کا سرِ عنوان ہے، عظمت قرآن کے سامنے سر جھکا دینا اور آیات الٰہیہ میں غور وتدبر کرنا اس کی دعوت ہے، جواں سال صاحب قلم کا کمال یہ ہے کہ اس نے جس اسلوب کو اختیار کیا از اول تا آخر اس کی رعایت کرنے میں وہ کامیاب رہے ہیں، یہ کتاب اس لائق ہے کہ اس کو ہر ہر زبان میں منتقل کیا جائے، گھروں میں روزانہ اس کے مضامین پڑھے جائیں، مساجد میں ہر نماز کے بعد اس کا ایک اقتباس پڑھا جائے، انفرادی مطالعہ اور اجتماعی تعلیم کے ساتھ تذکیر بالقرآن کے لیے یہ ایک نہایت عمدہ کام ہے، امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن ظاہری ومعنوی بہر اعتبار مزید پرکشش ہوگا۔

☆☆☆

تعارف وتبصرہ: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی
نام کتاب : تذکرہ (حضرت مفتی عبدالعلیم عیسیٰ صاحب وصی اللّٰہی)
مرتب : سید احمد انیس ندوی
ناشر : ادارہ افادات علوم وصی اللّٰہی، فیروزآباد

سوانح نگاری ایک مستقل فن ہے، کسی بھی زبان میں شاید جتنا ذخیرہ اس فن میں موجود ہے اس قدر کسی دوسرے فن کے نصیب میں نہیں، ہر شخص کا سوانحی خاکہ ہوتا ہے، ہر شخص کی سوانح حیات ہوتی ہے، شخصیات کی خصوصیات، کمالات، زندگی کا منظر و پسِ منظر، خدمات و اکتسابات کے اعتبار سے سوانح میں اختلاف ہوتا ہے، جس کی خدمات ومنفعت جس سطح کی ہوتی ہیں اسی کے بقدر اس سے متعلق عام طور پر سوانحی لٹریچر وجود میں آتا ہے، لیکن یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ بسا اوقات اللہ کے بعض ایسے برگزیدہ بندے جن کا شمار من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ میں ہوتا ہے اس طرح گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کرکے گذر جاتے ہیں کہ زمانہ ان سے متعارف ہی نہیں ہو پاتا، اور بعض وہ لوگ جو کسی شمار وقطار میں نہیں ہوتے مگر اسباب وسائل کی بنا پر ان کے نام کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے، یہ امر مسلّم ہے کہ سوانح ہر ایک کی ہوتی ہے، جس کی سوانح لکھنے والا کوئی نہیں ہوتا اس کی موت پر جب کوئی آنسو بہاتا ہے تو بسا اوقات وہی آنسو سوانح بن جایا کرتے ہیں، مسلمانوں کا یہ امتیاز ہے کہ ان کے یہاں سوانحی ادب میں تعمیری اقدار پر مشتمل سوانحی لٹریچر کا قابل قدر ذخیرہ ہے۔

زیرِنظر کتاب بھی ہمارے سوانحی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے، کتاب کے مشتملات سے مولانا عبدالعلیم عیسیٰؒ کی شخصیت اور ان کی مختلف جہتوں کا اندازہ ہوتا ہے، مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر عزیزم مرتب یہ محنت نہ کرتے اور یہ کتاب معرضِ وجود میں نہ آتی تو ہمارا سوانحی ذخیرہ ایک ایسی شخصیت کے تذکرہ سے خالی ہوتا جس کا فیض اس کی وفات کے بعد بھی جاری رہ سکتا ہے، المیہ یہ ہے کہ ہمارے مذہبی حلقہ میں بھی مادی شہرت اب اصل معیار ہے جبکہ قرآن کا اصول اِن اکرمکم عنداللہ اتقاکم ہے، اس کتاب کا مطالعہ کیجئے تو تقوی کے مظاہر سے آنکھوں کو روشنی اور دل کو سرور ملے گا، اپنیا صلاح کی فکر پیدا ہوگی، علم کے ذوق کو جلا ملے گی، تعمیری اقدار اور تہذیبی رویوں سے تعارف ہوگا، دین کی تڑپ اور ملت کی خبرگیری کا جذبہ پیدا ہوگا، لوگوں سے برتاؤ، حسب مراتب لوگوں کو برتنے کا انداز، رشتہ داروں سے تعلق و انسیت اور اولاد کی تربیت کا سلیقہ معلوم ہوگا، عام طور پر جو حضرات سارے جہاں کی خبر رکھتے ہیں ان کو اپنے گھر کی خبر نہیں ہوتی، اپنے رشتہ داروں کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا، اپنی اولادت کی تربیت پر توجہ نہیں ہوتی، اس پہلو سے یہ تذکرہ اور ممدوح قابل رشک ولائق تقلید ہیں۔

اس کتاب کو فاضل مرتب نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصہ میں ممدوح کے حالات زندگی از اول تا آخر جمع کرنے کی کوشش کی ہے جس کا مطالعہ سبق آموزی سے خالی نہیں، دوسرے حصہ میں ممدوح کی حیات مستعار کے مختلف شگفتہ پہلوؤں اور متنوع خدمات پر مشتمل مضامین جمع کیے گئے ہیں، یہ مضامین لکھنے والے ممدوح کے اقربا بھی ہیں، تلامذہ بھی، فیض یافتگان بھی ہیں اور مشہور علماء بھی، ان مضامین سے صاحب تذکرہ کی عظمت، خشیت، للّٰہیت، علمیت، اخلاص، خدمت خلق کا جذبہ، پاک طینتی اور نفاستِ ذوق وسلامت طبع کے ساتھ شخصیت و خدمات کے متنوع پہلوؤں کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی نافعیت اور خدمات کے دائرے کا علم ہوتا ہے، تیسرے حصہ کو صاحب تذکرہ کی مشاہیر امت سے ہوئی مکاتبت کے لیے خاص کیا گیا ہے، یہاں ان خطوط کو جمع کیا گیا ہے جو انھوں نے اپنے شیخ ومرشد اور دیگر اکابرین کو لکھے، ان خطوط سے نہ صرف بزرگ علما اور اہل اللہ سے ان کے تعلقات وروابط کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ لوگوں کے لیے اس میں عبرت کا بڑا سامان ہے، اپنی اصلاح کے لیے بڑے قیمتی اشارے ہیں، تزکیہ نفس سب سے بنیادی ضرورت ہے، مگر اسی پر توجہ سب سے کم ہوتی ہے، اور توجہ ہو بھی تو پھر عصر حاضر میں تزکیہ کے نام پر جو کاروبار ہے اس سے مزید بُعد پیدا ہوجاتا ہے لیکن اس کتاب میں موجود خطوط اور ان کے جوابات سے تزکیہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس کی صحیح نوعیت واہمیت کا اندازہ ہوتا، سب سے بڑھ کر ممدوح کی اس خصوصیت وعظمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تنہائی میں خود اپنی ذات اور اپنی اصلاح کے لیے کس قدر متفکر رہتے تھے۔

کتاب کا آخری حصہ صاحب تذکرہ کی شاعری پر مشتمل ہے، مرتب کتاب کے مطابق یہ شاعری صاحب تذکرہ کے ابتدائی زمانہ کی ہے، مگر پڑھ کر ان کے دعوے کو جھٹلانے کا جی چاہتا ہے، یہ شاعری بھی فنی پختگی اور سلامتِ فکر کا عکسِ جمیل ہے، بیشتر شاعری دعاء ومناجات اور اولاد وذریت کو وصیت و نصیحت پر مشتمل ہے، مگر شاعرانہ رنگ وآہنگ اور فکری جمال کا بہترین مرقع ہے، یعنی سچ پوچھیے تو یہ حصہ بھی نصیحت وعبرت سے خالی نہیں اسی آخری حصہ میں اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت صاحب تذکرہ نے جو نصیحت و وصیت کی تھی اسے بھی شامل کیا گیا ہے، جسے پڑھ کر آنکھیں آبدیدہ ہوجاتی ہیں، صاحب تذکرہ کی شریف النفسی، باطنی بزرگی اور حقیقی دینداری کا اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب میں شامل صرف یہی حصہ اگر لوگوں میں عام ہوجائے تو خواتین کی زندگی شاداب اور گھر نمونۂ جنت بن جائیں، حالانکہ پوری کتاب میں ایسی اور بھی

کئی چیزیں ہیں جو نفع عام کے لیے بڑے خاصے کی ہیں۔ (طوالت کے سبب یہاں اقتباسات وغیرہ نقل کرنے سے گریز کیا گیا)

فاضل مرتب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے نہ صرف سوانحی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کیا بلکہ ایک ایسی شخصیت سے متعارف کرایا جس کے بارے میں اختصار کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے طاب حیا وطاب میتا، جس کی زندگی اہل علم، علماء اور طلبہ کے لیے اپنے دامن میں بہت سے اسباق وعبرت رکھتی ہے۔

ہمارے سوانحی ادب کا یہ المیہ بھی ہے کہ عام طور پر اس موضوع سے متعلق جو کتاب بھی اٹھایئے اور اسے پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ کسی فرشتہ کی سیرت وسوانح ہے جو انسان کا روپ لے کر کچھ دن کے لیے دنیا میں آیا تھا اور مقررہ مدت گزار کر رخصت ہوگیا، اس پہلو سے ہمارے بڑے بڑے مصنّفین واہل قلم بھی محتاط نہ رہ سکے ہیں تو بعد میں آنے والوں سے شکوہ کیا؟ حالانکہ یہ حقیقت ہمارے سامنے پیش نظر رہنا چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی کامل نہیں اور کوئی نقائص سے پاک نہیں، نقائص سے پاک ہونا انسانی صفت نہیں، ہاں نقائص کو درکنار کرتے ہوئے اور نفس پر غلبہ حاصل کرکے جامع الکمالات ہوجانا انسانی کرامت ہے، اس قبیل کی سوانحی کتب کے مطالعہ سے اگر کسی انسان کی فرشتہ صفت تصویر قاری کے ذہن پر نقش ہوجائے اور پھر آئندہ کبھی اس کی انسانی فطرت کے بعض مظاہر کا ذکر چھڑے تو انسان کے دل ودماغ پر منفی اثر پڑتا ہے، اسی لیے ان سوانحی کتب کا مرتبہ ہی کچھ اور ہوتا ہے جن میں اس اعتراف وحقیقت کے ساتھ تحلیل وتجزیہ ہوتا ہے اور پھر کمالات وخصوصیات کو وضاحت کے ساتھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ عام لوگ اسے انسانی معاشرہ کے لیے بہترین نمونہ سمجھ کر قبول کرسکیں، دینداری کو اس طرح اپنا سکیں جیسے وہ ان کی اپنی ہی چیز ہو جو ان سے کھوگئی ہو، نہ کہ وہ اسے مشکل ترین امر سمجھ کر اس سے بدک جائیں۔

برادر عزیز سید احمد انیس ندوی نے گرچہ یہ کتاب بڑی محنت سے تیار کی ہے لیکن فنی اعتبار سے اسے مزید مفید بنایا جاسکتا ہے، اگر وہ بعض مقامات پر توضیحی حواشی، حوالے اور بالخصوص خطوط میں تعلیقات کا التزام کرتے تو اس کا حسن دوبالا ہوتا، مزید اگر وہ اس مفید ترین تصنیفی کاوش کو عقیدت مندانہ اسلوب کے بجائے علمی اسلوب میں طالب علمانہ قلم سے لکھتے تو اس کی فنی قدر میں اور اضافہ ہوتا، اچھی طرح یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ علمی دنیا ان تحریروں کی اہل علم کے یہاں اہمیت نہیں ہوتی جن تحریروں سے یا جن کے اسلوب سے قاری پر مصنف کی صاحب تحریر کی جانبداری عیاں ہوتی ہے، اس لحاظ سے مرتب کتاب کو اس پوری کتاب کا اسلوب تحریر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے، اپنے قلبی، نسلی، دینی اور عقیدت کے تعلق کے اظہار کی خاطر مقدمہ یا مفصل مضمون کافی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے یہ ایک قابل قدر کام کیا ہے اور نفعِ عام کے جذبہ سے کیا ہے، ایک ایسی شخصیت کا تذکرہ مرتب کیا ہے جس کا حق تھا کہ اس کی زندگی کو کھلی کتاب بنا کر بطور نمونہ عمل پیش کر دیا جائے لیکن ایسے مفید کام کے لیے عصری اسلوب اور معاصر تقاضوں کی رعایت ایک بنیادی ضرورت ہے جس سے مقصد بھی حاصل ہوتا ہے اور نافعیت بھی دوبالا ہوتی ہے ورنہ ایسی خوبصورت چیزیں بھی ایک مخصوص حلقہ کے لیے زینت وسامان افتخار بن کر رہ جاتی ہیں، مجھے امید قوی ہے کہ اس کا آئندہ ایڈیشن مزید خصوصیات کا حامل ہوگا، اس کی افادیت عام ہوگی اور اہل علم نوجوان صاحب قلم کی اس تصنیفی کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور سوانحی ادب میں اس کو ایک مفید اضافہ قرار دیں گے، یہی نہیں بلکہ عام علماء اور طلبہ اس کے مطالعہ سے اپنے لیے روشنی حاصل کریں گے۔

☆☆☆

نام کتاب : قرآن کریم اور درپیش مسائل کا حل (جہدِ مسلسل، جذبۂ صادق اور رجوع الی اللہ)
مصنف : ظفر الاسلام اصلاحی
ناشر : براؤن بک پبلیکیشنز، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
سنِ اشاعت: ۲۰۲۰ء
صفحات : ۱۱۲
قیمت : ۱۵۰روپئے
ملنے کا دیگر پتہ: حلقۂ درسِ قرآن ، اسلام منزل، اسٹریٹ نمبر۔ ۸،اقرأ کالونی،علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲
مبصّر : ڈاکٹر محمد صادق اختر ندوی (استاد،اے،ایم،یو، اے،بی،کے،گرلس اسکول)

زیرِ تعارف کتاب ''**قرآنِ کریم اور درپیش مسائل کا حل**'' (جہدِ مسلسل، جذبۂ صادق اور رجوع الی اللہ) کا انتساب مصنف نے اپنے رفیقِ مکرم مولانا محمد اسلام عمری مرحوم (وفات: ۱۳؍دسمبر ۲۰۱۹ء) کے نام کیا ہے۔ یہ انتساب اس وجہ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس طرح نہ صرف اپنے دوست کو ایک طویل عرصہ تک یاد رکھا جاسکتا ہے، بلکہ دوسرے بھی اسے پڑھ کر انہیں یاد کرتے رہیں گے۔اپنی باریک بینی اور تحقیق وجستجو کے اعلیٰ معیار کو بروئے کار لاتے ہوئے صاحبِ کتاب پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی (سابق صدر،شعبۂ اسلامک اسٹڈیز،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں انتھک محنت کی ہے، ان کی بیشتر تصانیف وتالیفات کا محور و مرکز قرآن کریم رہا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ مسائل کے حل کے لیے اس کتاب میں مصنف نے قرآنِ کریم کی ہدایات وتعلیمات کی اچھی وضاحت پیش کی ہے۔کتاب میں اس نکتہ پر خاص زور دیا گیا ہے کہ قرآن کریم کا اصل موضوع انسان ہے اور اس کے نزول کا بنیادی مقصد زندگی کے مختلف شعبوں میں انسان کو رہنمائی فراہم کرنا ہے۔زیرِ بحث موضوع پر کتابِ ہدایت کی متعلقہ آیات کی توضیح وتشریح بہت ہی آسان زبان اور عام فہم اسلوب میں کی گئی ہے، ان پر عمل کرکے انسان اپنے مسائل حل کرسکتا ہے، اپنی روز مرہ زندگی کو خوش گوار و پرسکون بنا سکتا ہے اور اخروی زندگی کے لئے نیک اعمال کا ذخیرہ جمع کرسکتا ہے۔

۱۱۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب میں متعدد ذیلی سرخیاں ہیں۔ باب اول (''**راہیں کھلتی ہیں**'') ہے۔ یہ دراصل ممتاز عالمِ دین، سابق امیرِ جماعتِ اسلامی ہند وصدر ادارہ تحقیق وتصنیفِ اسلامی (علی گڑھ) مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب کے مشتملات کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔اس باب میں زیادہ تر گفتگو اسی کتاب کے حوالے سے کی گئی ہے اور قرآنی آیات کی روشنی میں تقویٰ و پرہیزگاری، صبر واستقلال اور آپس میں اتفاق و اتحاد پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔عصرِ حاضر کے مسائل کے حل کے لئے قرآن سے رجوع، لوگوں کے ساتھ مساویانہ ومنصفانہ برتاؤ، حقوق العباد کی ادائیگی کے ذریعہ تعلقات و معاملات میں خوشگواری، محتاجوں ومحروموں کی اعانت، عدل وانصاف کا نظام برپا کرنے میں تعاون، اس ملک کی ترقی وخوش حالی کے لئے مسلمانوں کی صلاحیتوں کے استعمال کی ضرورت واہمیت، قرآن کے پیغامِ رحمت کو لوگوں تک پہنچانا، ملک وملت کے مسائل کے قرآنی حل پر سنجیدگی سے غور وفکر اور قرآن کی

روشنی سے فیض یابی سے ہی سماجی، معاشی و سیاسی کی زندگی کی ظلمتیں دور ہوں گی وغیر ہا ذیلی عناوین پر بہت ہی مفید و عمدہ بحثیں اس کتاب میں ملتی ہیں۔ باب دوم کا عنوان ہے: ''**مومن کے لیے جد و جہد اور مسابقت کا اصل میدان نیکی کمانا ہے**''۔ اس باب میں جمود و تعطل کو ختم کرنے اور جہدِ مسلسل پر قرآن مجید کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ نیک اور اچھے کام کا دائرہ بہت وسیع ہے، ان میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی شامل ہے، جد وجہد اور تگ و دو انسانی زندگی کا خاصہ ہے، آخرت سے بے فکر ہوکر محض فانی زندگی کی آرام و راحت کے خاطر بھاگ دوڑ کرنا اپنے آپ کو خسارے میں ڈالنا ہے، دنیا کا مال ومتاع بہت قلیل اور آخرت کی نعمتیں لامحدود اور دائمی ہیں، نیکی کی راہ میں نفع ہی نفع ہے، قرآن دنیا کے بارے میں غلط تصور کی اصلاح کرتا ہے اور مسابقت کا صحیح رخ اختیار کرنے کی ہدایت دیتا ہے وغیر ہا جیسے ذیلی عناوین کے تحت قرآنی ہدایات وتعلیمات کی بھرپور وضاحت کی گئی ہے۔ باب سوم (''**دعاء، اللہ رب العزت سے رجوع کرنے اور رحمت و مغفرت طلب کرنے کا بہترین ذریعہ**'') موجودہ تکلیف دہ حالات اور پریشان کُن صورتِ حال میں خصوصی اہمیت ومعنویت کا حامل ہے۔ حقیقت یہ کہ دعاء کے توسط سے انسان اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتا ہے، ربِّ کریم سے روکر گڑگڑا کر اپنی مرادیں مانگتا ہے اور اس کے فیض سے وہ قلبی سکون کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ قرآن مجید کی روشنی میں مختلف پہلوؤں سے دعاء کی اہمیت ومعنویت اور ضرورت بہت ہی واضح انداز میں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب کے کچھ ذیلی عناوین اس طرح ہیں: دعاء مانگنا انسانی فطرت ہے، دعاء مانگنے کی توفیق مل جانے سے ہی رحمتِ الٰہی کے دروازے کھل جاتے ہیں، دعاء مانگنا ہر حال میں موجبِ خیر و برکت ہے، دعاء اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط کرنے، رحمت ومغفرت طلب کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، دعاء مانگنے کو اللہ رب العزت پسند فرماتا ہے۔ مزید براں اس باب میں دعاء کے اصول وآداب، دعاء کے کچھ مخصوص اوقات اور دعاء مانگتے وقت عاجزی وانکساری، تضرع اور گریہ وزاری کیفیت کے اثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں ایک ''**ضمیمہ**'' ہے۔ یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں انسانوں کے عام مسائل کے حل کے لئے مختلف مواقع کی مخصوص قرآنی دعاؤں کو مع اردو ترجمہ مرتب کیا گیا ہے۔ اس ضمیمہ میں منقول قرآنی دعائیں یاد کرنے اور بار بار پڑھنے کے لائق ہیں۔ بلاشبہ دعاء ہر عبادت کی جان اور رجوع الی اللہ کا بہترین وسیلہ ہے۔ قرآنی دعاؤں کے ذریعہ دعاء مانگنا زیادہ بابرکت ونفع بخش ہے، دعاء قرآن وحدیث میں مذکور اصول وآداب (جیسا کہ اس کتاب میں تفصیل سے واضح کئے گئے ہیں)، خاص کر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور نبی کریم ﷺ پر درود وسلام کے ساتھ، مانگی جائے تو اس کی برکت و تاثیر اور بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر حال، ہر وقت، ہر جگہ اور ہر مسئلہ کے حل کے لئے دعاء کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ کرے یہ کتاب قارئین ومصنف کے لئے باعث افادیت و برکت ثابت ہو۔ آمین ثم آمین۔

☆☆☆